www.urduchannel.in

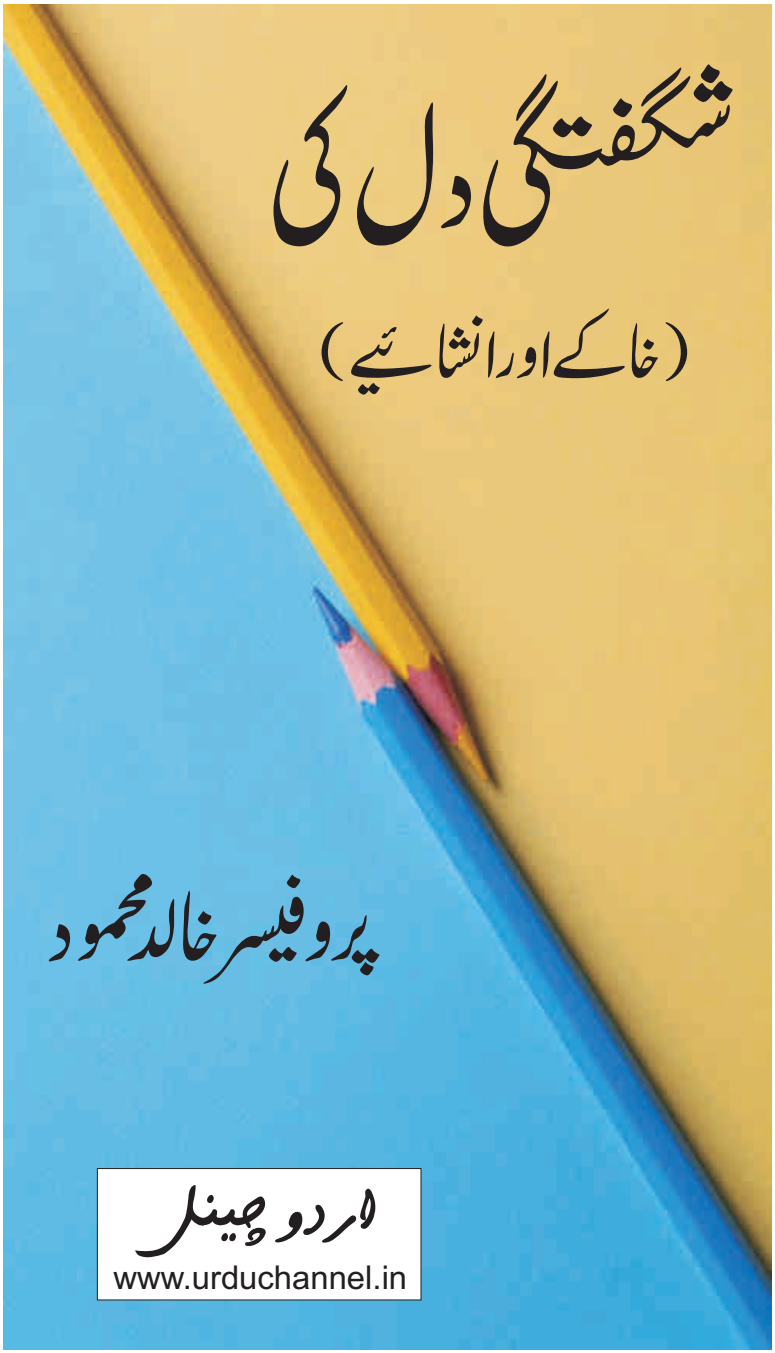

شگفتگی دل کی

(خاکے اور انشائیے)

پروفیسر خالد محمود

اردو چینل
www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

شگفتگی دل کی

(خاکے اور انشائیے)

خالد محمود

Aurang Zeb Qasmi.
Mardan, Katlang, Qasmi.
Senior SS
GHSS Zaimdara Dir.

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

© خالد محمود

Shaguftagi Dil Ki
by
Khalid Mahmood
Rs.68/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراونڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/68 روپے

ISBN :978-81-7587-809-9 سلسلۂ مطبوعات: 1597

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسا مارکیٹنگ سسٹمس، C-7/5 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

www.urduchannel.in

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سست و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظر استحسان دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل و عقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اولین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
منیجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

فہرست

۱۔ دیباچہ ڈاکٹر خالد محمود 7
۲۔ ڈاکٹر خالد محمود (قلمی چہرہ) پروفیسر ظفر احمد نظامی 11
۳۔ خالد محمود کے انشائے اور خاکے ڈاکٹر سید حامد حسین 15

خاکے

۴۔ اختر شناسی 25
۵۔ صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں 32
۶۔ ذکر اس پری وش کا 39
۷۔ عزیزی 46

انشائیے

۸۔ سٹی بس کا سفر 49
۹۔ آخری افطار 64
۱۰۔ جب اچانک میکے سے..... 80
۱۱۔ بہشت آنجا کہ..... 90
۱۲۔ قلم برداشتہ 100

انتساب

سرونج، بھوپال اور دہلی کے خوش مزاجوں
کے نام
کہ اس کتاب کے بیشتر مضامین کا تعلق انہیں بستیوں سے ہے

❖●❖

ڈاکٹر سید حامد حسین (مرحوم)
کے نام
جو لیاقت، شرافت، ذہانت، سادگی اور زندہ دلی کا سرچشمہ تھے

❖●❖

اور ان شگفتہ دلوں
کے نام
جن کے دل رفو ہو کر بھی شگفتہ ہی رہتے ہیں

❖●❖

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

کچھ اس کتاب کے بارے میں
اور
کچھ اس کتاب سے ہٹ کر

ادب کی تعبیر (مطبوعہ ۱۹۹۹ء) کی دوسری اشاعت (۲۰۰۱ء) میں ''دو باتیں'' کے عنوان سے میں نے جو معروضات قلم بند کئے تھے ان کا ایک مختصر اقتباس یہ تھا۔

''دو برس قبل جب میرے مضامین کا پہلا مجموعہ ''تحریر کے رنگ'' شائع ہوا تھا تو اس میں سنجیدہ مضامین کے علاوہ انشائیے اور نیم مزاحیہ خاکے بھی شامل تھے۔ تحقیق وتنقید کی سنجیدگی کے ساتھ یہ مذاق مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے دونوں رنگوں کے منتخبات کو ترمیم واضافے کے ساتھ علیحدہ علیحدہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ''ادب کی تعبیر'' اس منصوبے کی تشکیل کا جزو اوّل ہے۔

اور اب اسی منصوبہ کی تشکیل وتکمیل کے جزو ثانی کے طور پر خاکوں اور انشائیوں کا یہ مجموعہ ''شگفتگی دل کی'' پیش خدمت ہے۔

اس کتاب میں خاکوں اور انشائیوں کے علاوہ ایک دو ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جنہیں کلی طور پر نہ تو خاکہ کہا جاسکتا ہے اور نہ مکمل انشائیہ۔ جہاں تک انشائیے کا تعلق ہے یہ صنف یوں بھی اپنی تعریف کے تعین کی تکمیل میں سرگرداں ہے اور اس راہ سے خاطر خواہ کامیابی اسے تا حال حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ کچھ ناقدین نے ''خیال کی ترنگ'' کہہ کر اس کا دامن اتنا وسیع کردیا ہے کہ میرے بعض خاکے بھی اسی ترنگ کی زد میں آگئے ہیں۔ ان کے علاوہ

مشفق مکرم پروفیسر ظفر احمد نظامی کا تحریر کردہ ''خالد محمود۔ ایک قلمی چہرہ'' جو انہوں نے بڑے خلوص اور محبت سے لکھا تھا اور جو میرے دوسرے شعری مجموعے ''شعر چراغ'' (مطبوعہ

اورنگ زیب فاسمی

۲۰۰۱ء) میں شائع بھی ہو چکا ہے اس کتاب سے اپنے اسلوب اور موضوع کی گہری مناسبت اور مطابقت کی وجہ سے مکرر شائع کیا جارہا ہے۔

استاد محترم پروفیسر سید حامد حسین (مرحوم ومغفور) نے میرے خاکوں اور انشائیوں پر ایک مضمون کی شکل میں اظہار خیال فرما کر انہیں عزت بخشی اور اس طرح میری حوصلہ افزائی کی تھی میں ان کا یہ وقیع مضمون جو میرے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے احساس ممنونیت اور فخر وانبساط کے ساتھ اپنی اس کتاب میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

پروفیسر سید حامد حسین، بھوپال کے مشہور ومعروف حمیدیہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ یہی وہ کالج ہے جس میں جاں نثار اختر، حنیف اختر، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر ابو محمد سحر اور پروفیسر آفاق احمد جیسے نامی گرامی اساتذہ شعبۂ اردو سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ میں نے بی اے سال اول کی تعلیم کے دوران صرف ایک ہی برس اس کالج میں گزارا ہے (اس کے بعد سیفیہ کالج چلا آیا) مگر اس ایک ہی برس میں پروفیسر ابو محمد سحر (اردو) پروفیسر محبوب الرحمن (فارسی) اور پروفیسر سید حامد حسین (انگریزی) جیسے اساتذہ کے علم وفضل اور مشفقانہ سلوک نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ یہ ہستیاں اگرچہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر ان کی یادوں کی خوشبو سے مشام جاں آج بھی معطر ہے۔ حمیدیہ کالج کے ان اساتذہ میں یوں تو ہر ایک اپنی مثال آپ تھا لیکن مجموعی لیاقت اور صلاحیت کے اعتبار سے ڈاکٹر سید حامد حسین مرحوم ''انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' کی مثال تھے۔

میں اپنے آپ کو ان خوش نصیب لوگوں میں شمار کرتا ہوں جنہیں خدا کے فضل وکرم سے اساتذہ کی شفقتیں، شاگردوں کی محبتیں، عزیزوں اور اور رفیقوں کی چاہتیں، دوستوں کا خلوص اور گھر کا سکون بھی کچھ میسر رہا ہے۔ بعض اساتذہ بعض احباب اور بعض شاگردوں نے تو میری ایسی دلداری کی ہے کہ اگر اسے ناز برداری بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، ڈاکٹر سید حامد حسین مرحوم انہیں میں سے ایک تھے۔ ان کی عظمت کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

ایک روز مجھے ایک دبیز سا لفافہ ملا۔ چاک کیا اور دیکھا تو اس میں چند سطری ایک مراسلہ تھا اس مراسلے کا مضمون مجھے حرف بہ حرف تو یاد نہیں رہا البتہ مفہوم یہ تھا کہ میں لائبریری بیٹھا ہوا ایک تحقیقی مقالے کے لیے مواد تلاش کررہا تھا کہ اچانک آپ کی پی ایچ ڈی کا موضوع یاد آگیا۔ آپ کے موضوع سے متعلق جو کتابیں یا مضامین میرے سامنے آتے گئے میں ان کے حوالہ جات ایک کاغذ پر علیحدہ نوٹ کرتا رہا کچھ ضروری اقتباسات نقل بھی کرلیے۔ اب یہ سارا مواد آپ کے

www.urduchannel.in

پاس بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو ان حوالوں سے کافی مدد ملے گی اور آپ تندہی سے اپنا کام مکمل کر سکیں گے۔ اس مراسلے کے ساتھ باریک باریک حرفوں میں لکھے ہوئے آٹھ دس صفحات بھی منسلک تھے۔ میں اس خط کو پڑھ کر اور منسلکہ مواد کو دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ یا خدا ایسا بھی ہوتا ہے! جذباتی زیادہ ہوں۔ محبت کے اس عملی اظہار نے میری آنکھوں کے صحرا کو سمندر کر دیا۔ یہ خط استاد محترم ڈاکٹر سید حامد حسین مرحوم کا تھا۔ اس کے بعد حالانکہ میں انہیں اس زحمت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر وہ نہ مانے اور وقتاً فوقتاً میرے موضوع سے متعلق حوالہ جات بھیجتے ہی رہے۔ میرے زیادہ منع کرنے پر کہتے خالد صاحب میں اپنا کام کر رہا ہوں آپ اپنا کام کرتے رہیے۔ استاذی ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب نے جس موقع پر میری دست گیری فرمائی تھی ان کی اہلیہ حدیقہ بیگم اپنے پی ایچ ڈی مقالے کے لئے عبدالرحمن بجنوری پر ریسرچ کر رہی تھیں اور میرا موضوع تحقیق ''حیات ٹونک کی ادبی خدمات'' تھا جو بوجوہ مجھے بعد میں تبدیل کرنا پڑا اور میں نے اردو سفر ناموں پر اپنا کام مکمل کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میرا یہ تحقیقی مقالہ بعنوان ''اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ'' مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر حدیقہ بیگم سے میرا ایک رشتہ یہ تھا کہ ان کے شوہر میرے شفیق استاد تھے اور وہ خود میری شاگرد تھیں۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں (جبکہ میں نے ابھی تازہ تازہ ایم اے پاس کیا تھا) استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی عنایت خاص نے مجھے مادر علمی سیفیہ کالج کے شعبہ اردو میں ایم اے کی کلاس لینے کا موقع فراہم کر دیا۔ حدیقہ بیگم اس وقت وہاں ایم اے کی طالبہ تھیں اور اس رشتہ سے مجھے ''سر'' کہتی تھیں۔ اس دیرے رشتے کی وجہ سے مجھے ان کے گھر میں دہری محبت اور عزت حاصل تھی میں ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کو ''سر'' کہتا اور وہ مجھے ''سر'' کہہ کر مخاطب کرتیں۔ حامد حسین صاحب جو انتہائی خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والی طبیعت کے مالک تھے اس صورت حال پر کبھی کبھی بڑے مزے مزے کی باتیں کرتے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میرا تقرر ہو گیا اور میں دہلی آ گیا۔ یہاں سے جب کبھی بھوپال جانا ہوتا، ان کے گھر پر حاضر ہونے کی کوشش کرتا۔ میرے پہنچنے پر حدیقہ بیگم صاحبہ سے میری ملاقات پہلے ہو جاتی تو وہ فوراً سلام کرتیں اور پھر حامد صاحب کو آواز دے کر کہتیں آپ کے شاگرد تشریف لائے ہیں پھر مجھ سے کہتیں ''سر اندر تشریف لائیے۔ یہاں تشریف رکھئے۔'' ان کی آواز میں نرمی اور ٹھہراؤ، گفتگو میں شستگی اور خلوص، انداز میں سادگی اور شائستگی، مزاج میں سلیقہ اور نفاست اور برتاؤ میں خوش اطواری

اور رکھ رکھاؤ تھا۔ جس سے بات کرتیں وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ڈاکٹر حامد حسین صاحب اگر مجھے ان سے پہلے مل جاتے تو وہ بے ساختہ قسم کے اظہار مسرت کے بعد اپنی بیوی کو پکارتے۔ ''آپ کے استاد آئے ہیں۔'' دونوں میں بڑی محبت اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ آخر میں جب ڈاکٹر حدیقہ بیگم، صاحب فراموش ہو گئی تھیں تو حامد حسین صاحب نے ان کی بڑی خدمت کی اور خدمت کرتے کرتے ہی اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ حدیقہ بیگم صاحبہ کا انتقال ان کے کچھ عرصہ کے بعد ہوا۔

کسی شاعر نے کہا تھا۔

پسِ معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

شاید اسی لیے ڈاکٹر حامد حسین صاحب نے حدیقہ بیگم سے پہلے جہان فانی سے اپنا رخصت سفر باندھ لیا تھا۔ اب ان کے گھر میں نہ کوئی میرا استاد ہے اور نہ کوئی شاگرد ہے۔ ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنے والے میاں بیوی جو اخلاق حسنہ کے پیکر اور صالح تہذیبی اقدار اور اسلامی روایات کے امین تھے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

''خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را''

میں آنسوؤں کی سوغات لیے ان دونوں مرحومین سے اپنی عقیدت اور تعلق خاطر کا اظہار کرتا ہوں اور استاذی پروفیسر سید حامد حسین مرحوم کی عنایات خاص کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میری بے معنی اور بے جان سی تحریروں کو اپنے جادو اثر قلم کی جنبش سے بامعنی اور جاندار بنانے کی مشفقانہ کوشش کی۔

آخر میں اپنی اہلیہ پروفیسر تسنیم فاطمہ اور اپنی بیٹی فوزیہ آفرین کا شکر گزار ہوں اور ان کے حق میں دعا کرتا ہوں کہ انہیں دونوں کی بدولت میرے دل کی فضا شگفتہ اور میرے گھر کا چمن پُر بہار ہے۔

—— خالد محمود

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

□ پروفیسر ظفر احمد نظامی

ڈاکٹر خالد محمود

(قلمی چہرہ)

چہرہ کتاب نما، جسم ماہتاب نما۔ دراز قد، دلکش خال وخد۔ صحت مند جسم، دلربا طلسم۔ ستواں ناک، زبان بے باک۔ آنکھوں میں چمک، رُخ پر دمک۔ تاحدِ نظر پیشانی، دلیلِ خوش بختی وجانفشانی۔ یہ ہیں ممتاز شاعر وادیب، زبان وادب کے نقیب۔ رہبر منزلِ تحقیق، خارزارِ تنقید کے رفیق۔ ایک کامیاب استاد، مجسم اعتبار وپیکرِ اعتماد۔ بے نیازِ زیاں وسود۔ یعنی ڈاکٹر خالد محمود.....!!

خالد پندرہ جنوری انیس سو اڑتالیس کو اس جہانِ آب وگل سے متعارف ہوئے، سروَنج کی جانفزا فضاؤں کے عارف ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں پائی، اپنی دنیا آپ بنائی۔ اردو میں ایم اے کی سند لی، پھر اپنی روش بدلی۔ درجن بھر ڈگریوں کا بوجھ اٹھایا، خود کو پی۔ ایچ ڈی سے سجایا۔ درس وتدریس کو پیشے میں ڈھالا، جامعہ ملیہ سے وابستگی اختیار کی، اردو کی خدمت شعار کی۔ ورک شاپوں کی رونق بڑھائی، محنت وریاضت کی داد پائی۔ مگر بے چارے طلبہ پر غضب کیا، بے شمار نصابی کتابوں کو مرتب کیا۔ اب تک اس کام کے لیے معروف ہیں، تصنیف وتالیف میں مصروف ہیں۔

انہوں نے ''سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ''، ''سعیٔ حاصل'' سے بابِ تنقید کو

وا کیا۔ کرۂ ارض پر ''سمندر آشنا'' ہوئے ''شعر چراغ'' کے نور پر فدا ہوئے۔ ''شگفتگی دل'' سے ''تحریر کے رنگ'' دکھائے، ''کتنے خوبصورت پھول'' کھلائے۔ ''ماحول کے ذریعہ تعلیم'' کو سنوارا، گوری کی سُندرتا کو نکھارا۔ تبصروں کو بے لاگ کیا، اداریوں کو آگ کیا، انشائیوں کے گیسو سنوارے، قلمی چہروں کے نقوش اُبھارے۔ داد وتحسین کا جام پایا، ہر تخلیق پر انعام پایا۔

خالد کانفرنس میں بولتے ہیں، سیمیناروں میں لب کھولتے ہیں۔ نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں، مشاعروں کا انتظام کرتے ہیں۔ انجمنوں کے روح رواں ہیں، تنظیموں کے میرِ کارواں ہیں۔ ادبی محفلوں کی جان ہیں، ثقافتی مجلسوں کی شان ہیں۔ اردو ان کا ایمان ہے، ادب ان کی جان ہے۔ اردو کی ترویج وتبلیغ میں آگے بڑھتے ہیں، کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ صلہ کی پروا کیے بغیر اردو پڑھاتے ہیں، اردو خواندگان کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ غیروں کے غم میں تڑپتے ہیں، معیاری رسائل میں چھپتے ہیں۔ ان کے اشعار ذہن ودل کو گدگداتے ہیں، خلوت وجلوت میں یاد آتے ہیں۔ میر وغالب پر جان چھڑکتے ہیں، ان کے ایک ایک شعر کو پہروں تکتے ہیں۔

بھوپال سے انہیں عشق ہے، جو ادب کا شیراز، تہذیب کا دمشق ہے۔ بار بار اس کا طواف کرتے ہیں، اس کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں، وہ دلّی میں بھوپال کے غیر سرکاری نمائندہ ہیں، لگتا ہے بھوپال والوں کے لیے ہی زندہ ہیں۔ ان کا گھر بھوپال ہی کی ایک شاخ ہے، 'بھوپال تال' کی طرح ان کا دل بھی فراخ ہے۔

وہ بڑے مہمان نواز ہیں، مدھیہ پردیش کے لیے وجہِ عزّ وناز ہیں۔ کبھی سنبھلتے ہیں کبھی گرتے ہیں، اپنی کار لیے لیے پھرتے ہیں، تاکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو لاسکیں، انہیں ہمہ وقتی مہمان بناسکیں۔ ان کی مدارات کرتے ہیں، محبتوں کی برسات کرتے ہیں۔ جب پہلے مہمان سے بچھڑتے ہیں تو دوسرے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ انہیں کھانسی ہو یا بخار، نبض تیز ہو یا سُست رفتار، وہ دوستوں

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

سے دامن نہیں بچاتے۔ کسی بھی حال میں ہوں، انہیں نہیں بھلاتے۔ ہر معاملہ میں وفا شعار ہیں، بے پناہ وضع دار ہیں۔ دعوتیں کرنا انہیں پسند ہے، ان کا معیار شکم پروری بلند ہے۔ خلوص کے زیر دام آتے ہیں، اپنے پرایوں کے کام آتے ہیں۔

وہ زندگی کے احوال پر کاربند ہیں، مگر بڑے ہی عجلت پسند ہیں۔ انہیں کھیل کود سے رغبت نہیں، فٹ بال، کرکٹ سے کوئی محبت نہیں۔ البتہ دماغی ورزش خوب کرتے ہیں، ذہنی کسرت سے مرغوب کرتے ہیں۔ ادبی جلسوں میں باجماعت شریک ہوتے ہیں، داد کے ڈھونڈورے بھر بھر کر ڈھوتے ہیں۔

خالد، پابند رسم ورواج ہیں، بڑے منکسر المزاج ہیں۔ سب سے جھک کر ملتے ہیں، پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ ان کا ہر انداز معصوم ہے، ان کے خلوص کی ہر جگہ دھوم ہے۔ وہ ہر شخص پر اعتبار کر لیتے ہیں، کام آنے کی ہر حد پار کر لیتے ہیں۔ دوستوں کو قرض دینا انہیں مرغوب ہے، قرض دے کر واپس نہ لینا محبوب ہے۔ دراصل وہ اپنے خود ساختہ اصولوں کی دنیا میں رہتے ہیں، اپنے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

ہر کس و ناکس پہ کر لیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالدؔ باخبر ہوتے ہوئے

○○

"..... خالد محمود سادہ دل، سادہ مزاج، نیک سیرت اور پُر خلوص طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے ٹوٹ کر محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا دل سے احترام ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی بڑھ چڑھ کر دل سے خدمت بھی کرتے ہیں اور اپنے اس عمل سے خوش بھی رہتے ہیں اور اسے حاصل بھی جانتے ہیں۔ مہمانوں اور دوستوں کے ساتھ اس طرح کا حسن سلوک روا رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کی حالت پر ترس آنے لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنوں پر بے دریغ خرچ کر کے اس حد تک خوش ہوتے ہیں، جس طرح خالد محمود ہوتے ہیں۔"

—— پروفیسر عبدالقوی دسنوی

www.urduchannel.in

□ ڈاکٹر سید حامد حسین (مرحوم) بھوپال

خالد محمود کے انشائیے اور خاکے

خالد محمود کی اصل شناخت ان کی شاعری ہے۔ لیکن ان کے کئی ایسے گن بھی ہیں جو شرمندہ نہیں کرتے لیکن حیرانی میں ضرور ڈالتے ہیں۔ ان کی شگفتہ مزاجی، اور شگفتہ بیانی بھی ان میں سے ایک ہے۔ بظاہر تو یہ "ساتویں اور آٹھویں دہے" کے مستند اور سکہ بند شاعر کا شیوہ نہیں۔ بھلا جب کالی، پیلی، کھردری، اٹ پٹی غزل اور کھنڈروں، گٹروں اور جھاڑ جھنکاڑ میں پلی بڑھی نظم کا بول بالا ہو تو ہنسنا، ہنسانا، لطف لینا اور سلیقہ برتنا اپنے آپ فیشن سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک مخلص دوست کے ساتھ جو کسی خاص پایے کے جدید شاعر بھی ہیں، ہم اپنے تعلقات کے بہتر ہونے کا ہنوز انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں چیلنج کیا تھا کہ ہم جدید فن کی کم سے کم الفاظ میں تعریف کریں اور ہم نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک جہاں ہماری برداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی ہیں، ہمیں سمجھنا چاہئے کہ وہیں سے جدید فن کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ خالد محمود یہ نوبت نہیں آنے دیتے۔ ان کی شاعری بھی حدود میں رہتی ہے اور ان کا مزاج بھی۔ ان کے مزاج میں نوجوانوں کی سی شوخی ہے لیکن ان کے انداز میں گزرے وقتوں کے بزرگوں جیسی مروّت اور شائستگی۔ زیادتی ان کے آئین حیات کا اصول نہیں۔ ان کے نزدیک نوکِ قلم کا مصرف محض چبھن پیدا کرنا نہیں۔ وہ اس کا استعمال زندگی کی کشتیوں اور دائروں کو

سنوارنے اور سجانے کے لیے کرتے ہیں۔

خالد محمود کے خاکے نہ تو ستم شعاری کا نمونہ ہیں اور نہ ظریفانہ کھلواڑ کے۔ لیکن ستم ظریفی کو انہوں نے فن لطیف کے درجے پر پہنچایا ہے۔ عبدالطیف اعظمی کے خاکے "ذکر اس پری وش کا....." کا عنوان غالب کے مصرع کا نصف آخر ذہن قاری کے لیے چھوڑتے ہوئے، نصف اول کو ستم ظریفانہ رمزیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ قاری اپنے ذہن میں پری اور پری زاد، دیو اور دیوزاد اور عبداللطیف اعظمی صاحب کا تصور اور تقابل کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ "عبداللطیف اعظمی ایک ادارہ ہیں۔" ثبوت ملاحظہ ہو:

> "یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں۔ لیکن لطیف صاحب کے اندرون میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں۔ ان حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں۔ جامعہ ملیہ میں یہ آٹھ دس افراد بیک وقت کبھی یکجا نہ رہے ہوں گے مگر لطیف صاحب کے دل و دماغ کے ہوسٹل میں روم پارٹنرز ہیں۔"

عبداللطیف اعظمی کے محققانہ کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تاریخ پیدائش سے متعلق، پیدا ہونے والے شخص کا دعویٰ بھی غلط ثابت کر دکھاتے ہیں..... وہ انتہائی محتاط قسم کے محقق ہیں۔ تاریخ ولادت کی تصدیق کے لیے صاحب ولادت کے والدین کا نکاح نامہ طلب کر لیتے ہیں۔ کبھی اس قسم کی دلیل لاتے ہیں کہ فلاں ادیب کی بائیں آنکھ میں دائیں جانب سرخ رنگ کا تل ہے اور ایسے لوگ دسمبر کی

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

پندرہ سے پچیس تاریخ کے درمیان پیدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔
اگر خدانخواستہ کسی ایسے شخص کے میونسپل کاغذات، ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور
اسکول کی سند یا خود موصوف یعنی صاحب ولادت دسمبر میں پیدا ہونے کا
دعویٰ کریں تو لطیف صاحب ان کی پچھلی سات پشتوں اور آئندہ سات
نسلوں کو دسمبر میں پیدا نہ ہونے دیں گے..... شاعر اور ادیب کی زندگی
اور موت لطیف صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ جب اور جہاں چاہیں پیدا
کردیں جس تاریخ کو چاہیں ماردیں۔ نہ جانے کتنے شاعروں اور
ادیبوں کو اپنی پیدائش اور وفات کے معاملے میں شکوک وشبہات میں
مبتلا کر رکھا ہے۔"

عبداللطیف اعظمی کو "تحریک" ثابت کرنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے:

"لطیف صاحب جب متحرک ہوتے ہیں تو سراپا تحریک نظر آتے
ہیں۔ بلکہ دیکھنے والوں میں بھی تحریک پیدا کردیتے ہیں۔ لطیف
صاحب چلتے وقت سیکنڈوں سے زیادہ نظر ہی نہیں آتے وہ تو بس ایک
چھلاوہ ہیں۔ چشم زدن ہیں اپنے گھر اور اپنے گھر سے اردو گھر (جسے
وہ اپنا ہی گھر سمجھتے ہیں)۔ اردو گھر سے جامع مسجد اور جامع مسجد سے
مکتبہ جامعہ پہنچ جاتے ہیں۔"

عزیز اندوری پر خالد محمود نے ان ہی کے الفاظ میں اک "مشتی خاکہ" لکھا ہے۔
خاکے میں ستم ظریفی کا رنگ سوا ہوگیا ہے۔ شروع کرتے ہیں:

"ممکن ہے مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہو کہ اندور کی دو چیزیں
زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو اندوری توس (پاپے) اور دوسرے عزیز

اورنگ زیب قاسمی

اندوری ..... اندور کے توس چائے میں بھگو کر کھائے جاتے ہیں۔
چائے میں بھیگنے کے بعد ان توسوں کی شکل دیکھ کر عزیز اندوری بہت یاد
آتے ہیں۔"

یہ عبارت پڑھ کر آپ کو عزیز اندوری کو دیکھنے کا ضرور جی چاہنے لگے گا۔ عزیز
اندوری کو عزیز افادی ثابت کرتے ہوئے خالد محمود لکھتے ہیں:

"ان کے ادبی مشاغل، اقتصادی مشاغل اور دلچسپ مشاغل ایک ہی
تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انہوں نے بہت لکھا ہے۔ مگر دوسروں کے لیے
زیادہ، اپنے لیے کم..... ان کی شاعری تو خیر کوئی کیوں لیتا، البتہ نثر میں
انہوں نے وہ ایثار دکھایا کہ مصحفی کو بھی شرمندہ کردیا۔ اچھی تحریریں
دوسروں کو دے کر کمزور تحریریں خود رکھ لینا کوئی معمول بات نہیں۔ اسلام
نے کہا ہے کہ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرو، وہی اپنے بھائی کے لیے بھی
پسند کرو۔ عزیز اندوری نے اس معاملے میں اسلام کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔"

"صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں" کے بارے میں یہ طے کرنا کہ وہ خاکہ ہے،
انشائیہ ہے، خاکہ نما انشائیہ ہے یا انشائیہ نما خاکہ، تاثر ہے یا رسم ودستور کی ادائیگی،
یہ ہمارا مقصد نہیں۔ بات خالد محمود کے لطف بیان کی ہے، وہ ہے اور اس کے پیچھے
تقویت دینے والا خلوص، اپنی طرف کھینچنے والا کھراپن اور توجہ کو گھیر لینے والی
بیساختگی ہے۔ انشائیے کی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے یوں تو بہت کچھ کہا گیا
ہے۔ تغزل کی طرح انشائیے کی روح کو بھی تعریفات کے گھیرے میں لینا ممکن
نہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ انشائیہ، اسلوب تحریر کا نام نہیں۔ وہ ذہن کی رَو کا انداز ہے۔
انشائیہ ایک ایسی ترنگ ہے جو کہیں سے اٹھتی ہے اور کسی بھی سمت میں بڑھتی اور
پھیلتی ہے۔ پھر اچانک مڑ جاتی ہے۔ اس سمت کا اپنا نام نہیں ہوتا۔ یہ رَو اس سمت

www.urduchannel.in

کا نام دیتی ہے۔ خالد محمود کی تحریرات بھی اکثر اسی قسم کی تخلیقی حالت وجد کی پیداوار ہیں۔ اگر ادبی ہاٹ میں کثرت استعمال سے یہ سکّہ گھس نہ گیا ہوتا تو اس کیفیت کے لیے ''من موجی'' کی اصطلاح خالد محمود کے اسلوب کے ایک امتیاز کو نمایاں کرنے کا ضرور جتن کرتی۔

ڈاکٹر صغرا مہدی کے اس وداعیہ میں کہیں یہ تاثرات ابھر کر آتا ہے:

''کبھی وہ ہم سے لڑتیں۔ کبھی ہمارے لیے دوسروں سے۔ کبھی ڈانٹتیں۔ کبھی سمجھاتیں۔ اگر انہیں یہ احساس ہوجاتا کہ ان سے زیادتی ہوگئی ہے..... تو بے چین ہوجاتیں اور اس وقت تک بے چین رہتیں جب تک اس کی تلافی نہ کرلیں۔ ان کی تلافیاں اکثر بڑی خوش ذائقہ، رسیلی اور خوشبودار ہوتیں۔ کبھی کبھی گرم گرم نمکین تلافیاں بھی چائے یا کافی کے ساتھ نظر آجاتیں۔''

اور کہیں یہ پُر لطف نقشہ نظر آتا ہے:

''صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے۔ ایک زمانے میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کون تھا جوان کی زد سے بچا ہو..... مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہونگ کرتیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے۔ مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ہیں..... اگر یہ کسی جلسے یا مشاعرے میں پیچھے بیٹھی ہوں تو انہیں آگے بلا لینا چاہئے، ورنہ سامعین کا شاعر کے جذبات واحساسات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔''

خالد محمود کے انشائیوں میں زبان کے ساتھ بڑا سلیقہ مندی کا سلوک ملتا ہے۔ آپ کو ابھی تک ایسا شعبدہ گر نہیں ملا ہوگا۔ جو لیمو کو بغیر کاٹے اس کا عرق نچوڑ لے۔ لیکن خالد محمود قیصری آپریشن کے بغیر الفاظ کے بطن سے معنی کا جوڑا پیدا کرلیتے ہیں۔ ایک معنی جو سنجیدہ لغت نگار کی ڈکشنری کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا جو شوخ نکتہ داں کے لیے ذکاوت آمیز بصیرت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ خالد محمود اپنی تراکیب سے چقماق کا کام لیتے ہیں ان کے الفاظ قاری کے ذہن میں باہم ٹکرا کر ایسے شرارے پیدا کرتے ہیں جو کائنات معنی کے کئی غیر متوقع گوشوں کو روشن کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ادب کے ادنیٰ ہنرمند اور اعلیٰ فنکار میں یہی فرق ہے کہ عام لکھنے والا صرف لفظوں کی سوداگری کرتا ہے۔ الفاظ اس کے لیے عام اشیائے صرف کی طرح ہوتے ہیں جو افراد کے اظہار و بیان کی سطحی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ادبی فنکار لفظوں کو تراش اور گڑھ کر ان میں نگینوں کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے یہ تراش نگینوں کے پہلوؤں کو نئی چونکا دینے والی تابناکی بخشتی ہے۔

خالد محمود کے انشائیوں میں لفظوں کی اسی تراش خراش، تابناکی اور چکا چوند کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت یہی ہے کہ اس میں سطحیت کی بے تاثیر یکسانیت نہیں۔ ان کے بیان میں ایک ایسی معنوی تابکاری کی گنجائش جابجا نظر آتی ہے جو فکر و خیال کی کئی اندرونی تہوں پر اپنا نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خالد محمود کو اپنے بیان میں ایسے عناصر داخل کرنے میں خاص دلچسپی ہے جو قاری کے لیے غیر متوقع ہوں اور اس کے لیے آسان حیرت کا سبب بنیں۔ آسان حیرت سے مراد وہ ردعمل ہے جو قاری کو ہم قدم بنائے رکھے، جہاں قاری خوشی خوشی مصنف کے ساتھ رہے۔ داستان گو اپنے محیر العقول بیان سے قاری کو مبالغے اور بے یقینی کی دنیا میں ڈھکیل دیتا ہے۔ ایک اچھا فنکار

www.urduchannel.in

اپنے قاری کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

خالد محمود اپنے انشائیے میں اکثر ایسی ہی بیانیہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔ ایک انشائیے ''سٹی بس کا سفر'' میں لکھتے ہیں:

''یہ نہ سمجھ بیٹھیے کہ خدانخواستہ دلی میں قطار میں کھڑے ہونے کا رواج نہیں۔ یقیناً ہے جب تک بس نہیں آتی لوگ نہایت صبر وسکون کے ساتھ صف بنائے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر جیسے ہی بس پر نظر پڑتی ہے پتھروں کے زمانے کی تہذیب جاگ اٹھتی ہے..... مساوات کا یہ عالم کہ محمود وایاز، بس کے ایک ہی دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی دروازے سے اترتے ہیں۔ دلی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ بس میں نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں..... یوں بھی سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت اترنے والوں کی زیادہ فکر رہتی ہے..... لوگ اترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو۔ بار بار بس میں سوار ہونے اور اترنے کی بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والوں میں..... ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ہر طرح کے لوگ ایک دوسرے میں اس قدر گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ دلی میں زندگی کا بڑا حصہ لوگ بس اسٹاپ پر گزارتے ہیں۔''

اسی طرح سیٹ پر بیٹھنے کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر آپ کے قریب والا شخص اپنی حرکات وسکنات سے اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا ہو تو بالکل اسی طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح مچھلی کے شکار کے وقت ڈور ہلنے پر ہو جاتے ہیں..... پھر اس سے پہلے کہ بیٹھا ہوا شخص اپنی

جگہ سے پورا اٹھے۔ اپنے آپ کو اس کی جگہ پر گرا دیں۔ پھر اپنی دونوں ٹانگوں کو اتنا اوپر اٹھائیں کہ ٹانگیں آپ کے سر کے قریب پہنچ جائیں۔ اس طرح اس کو باہر آنے کی جگہ دیتے ہوئے ٹانگوں کو نیچے گرا لیں..... دلی میں یوگا کی ٹریننگ کا ایک بڑا مقصد سٹی بس کے سفر میں سیٹ حاصل کرنے کا فن سکھانا ہے۔''

ایک اور انشائیے ''جب اچانک میکے سے بیوی آجائے'' میں خالد محمود نے بیچارگی کے بیان سے ایک مزاحیہ صورت حال ترتیب دی ہے۔ اس انشائیے میں بھی خالد محمود نے غیر راست بیان کے پُر لطف امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انشائیے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

''کسی بیباک شاعر نے کیا خوب کہا ہے: آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ۔ یہ مصرع سن کر ہمیں بھی اپنا زمانہ یاد آ گیا۔ سبحان اللہ کیا اچھے دن تھے۔ ہم سینکڑوں نگاہوں کے مرکز تھے۔ ہر وقت کچھ حسینوں کی اور کچھ ان کے والدین کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آؤ بھگت ہوتی۔ پیار محبت کے لیے ڈونگرے برستے اور ہماری تعریف وتوصیف میں وہ ساری باتیں کہی جاتیں جو ہمارے اندر نہ پہلے تھیں اور نہ آج ہیں۔''

بیوی کی اچانک واپسی اور گھر میں مشاعرے کے اہتمام کے نتیجے میں افراتفری سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے نمٹنے کے لیے جو قدم اٹھائے جاتے ہیں، ان کا بیان ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

''سب سے پہلے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان

www.urduchannel.in

اپنے مقام پر پہنچانے کی ناکام کوشش کی۔ ہمارا یہ اضطراری عمل ایسا ہی تھا جیسے کوئی چور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان باندھ کر لے جانا چاہتا ہو۔ چنانچہ ایسے غیر فطری عمل کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ جو سامان اپنی جگہ برقرار تھا وہ بھی بیقرار ہو گیا۔"

اس انشائیے میں خالد محمود نے اپنی ایک مزاحیہ غزل بھی شامل کی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

کس قدر کیف بداماں ہیں ہماری بیوی
ایسی کیا ہوں گی کسی اور کی پیاری بیوی
اپنے میکے کی ہیں گر راج دُلاری بیوی
تو ہیں سسرال کی بھی آنکھ کی تاری بیوی
سب عزیزوں نے بیک سنگ کہا ہے ہم سے
خوب سیرت بھی ہیں واللہ تمہاری بیوی
کبھی خوش ہیں تو نظر آتی ہیں پوری شوہر
کبھی غصے میں وہ بن جاتی ہیں ساری بیوی
ہم کو بھاتی ہے اسی وقت سے صورت ان کی
اپنے میکے میں تھیں جس وقت کنواری بیوی

خالد محمود کی تحریرات جن میں ان کے تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں، زبان کے تخلیقی استعمال پر ان کی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی سنجیدہ تحریرات منطقیت اور حقیقت حال کے اظہار کو مرکزی اہمیت دینے کے باوجود محض ریگ زار الفاظ کا نقشہ نہیں پیش کرتیں۔ ان کی اس خلاقانہ صلاحیت نے جس کا بھرپور

اورنگ زیب قاسمی

اظہار ان کی شاعری کی شکل میں نظر آتا ہے، ان کی اختراعی ہنرمندی کو نمایاں طور پر تقویت پہنچائی ہے۔ اس ہنرمندی نے خالد محمود کے انشائیوں میں خاص طور پر خیال افروز تراکیب و تماثیل کی تشکیل میں مدد کی ہے۔ لفظوں کے انتخاب، مناسبتوں کے اہتمام، استعاراتی نظام کی ترتیب میں خالد محمود نے قابل توجہ فنکارانہ شعور کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

خالد محمود کی ادبی کاوشوں کے موجودہ ذخیرے کے سرسری جائزے سے ہی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایسی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں جو صرف ایک خصوصی اسلوب تک محدود نہیں۔ وہ الگ الگ نوع کے اسالیب نثر و نظم پر یکساں اعتماد کے ساتھ قدرت رکھتے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تخلیقی نثر کو مالا مال کرنے کی جانب اور زیادہ توجہ کریں گے۔

○○

www.urduchannel.in

اختر شناسی

(یہ خاکہ جشنِ اختر سعید خاں کے موقع پر بھوپال میں پڑھا گیا تھا)

بعض باتیں اس طرح آناً فاناً واقعات بن جاتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور اگر ان واقعات کا تعلق آپ کے کسی جذبۂ خواہش یا آرزومندی سے ہو تو یہی حیرت، خوشی اور مسرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آج کی یہ تقریب سعید میرے لیے ایسا ہی ایک واقعہ ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے استاذی پروفیسر آفاق احمد صاحب اپنا چیک اپ کرانے دہلی تشریف لائے تھے۔ برادر محترم پروفیسر عتیق اللہ صاحب (صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) نے اسکورٹ ہارٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر Rissam سے ان کے لیے وقت طے کر لیا تھا۔ دہلی میں میرا گھر اسکورٹ سے قریب ہے اس لیے آفاق صاحب کا قیام میرے ہی غریب خانے پر تھا۔ ڈاکٹر Rissam سے ملاقات کے بعد جب ہم لوگ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے تو دورانِ گفتگو بھوپال میں ہندی والوں کی جانب سے آفاق صاحب کے استقبال کا ذکر آ گیا۔ آفاق صاحب نے کچھ اخبارات بھی دکھائے۔ عتیق اللہ صاحب بھی موجود تھے۔ بہت سی باتیں ہوئیں مگر میرے دل میں خیال آیا۔ کیوں نہ محترم اختر سعید خاں صاحب کا جشن منایا جائے۔ میں نے فوراً ہی اس خیال کو آفاق صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ عتیق اللہ صاحب نے بھی اس

خیال کی بھرپور تائید کی۔ آفاق صاحب تو ایسا لگا جیسے اس تجویز کے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ بولے، تم آؤ گے؟ عرض کیا ضرور۔ فرمایا بس تو پھر سمجھو ہو گیا۔ آفاق صاحب نے بھوپال پہنچنے کے چند ہی روز بعد فون کیا۔ خالد میاں جشن ہو رہا ہے۔ بس تیار ہو جاؤ! دو روز بعد اسپیڈ پوسٹ سے ان کا خط بھی مل گیا۔ حلقہ ارباب ادب کے پیڈ پر لکھا تھا:

> ''برادر عزیز آپ سے دلی میں زبانی اور پھر ٹیلی فون پر گفتگو ہو چکی ہے۔ شاہد صاحب کو بھی آج اسپیڈ پوسٹ سے خط لکھ رہا ہوں۔ دیکھئے یہ اختر سعید خاں کا جشن آپ کی فرمائش پر ہو رہا ہے۔ خصوصی پرچہ آپ پڑھیں گے۔ شاہد صاحب کو بھی ضرور لائیں۔ آپ کو شاہد صاحب کا پیچھا لینا پڑے گا۔ وہ آ گئے تو لطف آ جائے گا۔ آج کل تیاریوں میں لگا ہوا ہوں بلکہ یوں کہوں کہ شب و روز۔ پتہ نہیں پھر وقت مہلت دے یا نہ دے۔ یہ کام کر جاؤں۔''

۱۷ر جنوری ۲۰۰۲ء کے خط کا آخری جملہ بڑا معنی خیز تھا۔ اُن کے لہجے میں آس و یاس کی جو ملی جلی کیفیت تھی اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس دن سے آج تک میں اختر سعید خاں صاحب کے طلسم خیال میں ہوں۔

بھوپال کے پاس فخر و انبساط کے حوالوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ حسن فطرت کا شہکار بڑا تالاب۔ ہے۔ مولانا عمران خاں کا ثمرِ کاوش تاج المساجد ہے۔ پیر منے میاں کا فیضِ معرفت ہے۔ اقبال کی میزبانی کا شرف ہے۔ نواب صدیق حسن خاں، سید سلیمان ندوی، عبدالرحمٰن بجنوری اور ان جیسے دوسرے صاحبان علم و دانش سے وابستگی ہے۔ سلفیہ کالج ہے، علم پرور بیگمات کی لائقِ رشک حکمرانی ہے۔

www.urduchannel.in

ان کے علاوہ ان گنت کھلاڑی' شاعر' ادیب' سیاست داں اور فنکار ہیں جنھوں نے ساری دنیا میں بھوپال کا نام روشن کیا اور بھوپال بجا طور پر جن پر فخر کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

خوش بختی سے ہمارے عہد میں بھی اس پائے کی ہستیاں موجود ہیں جنھوں نے بھوپال کی عزت' شہرت' ناموری اور وقار میں اضافہ کیا ہے۔ ان ہستیوں میں ایک نہایت اہم اور معتبر ہستی کا نام نامی اختر سعید خاں ہے۔

اختر سعید خاں ایک خوش وضع' خوش بیان' اور خوش اطوار انسان ہیں۔ خدا نے انھیں کمال فن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی انسانی صفات سے بھی سرفراز کیا ہے۔ اپنے چھوٹوں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی' بڑوں کی عزت اور احترام اور ہم چشموں کی معاونت اور دلنوازی ان کی شناخت کے وسیلے اور مقبولیت کے اسباب ہیں۔

میں نے پہلی بار اپنے وطن سرونج میں اختر سعید خاں کا نام سنا تھا۔ یہ کوئی ۳۵۔۴۰ برس پرانی بات ہے۔ سرونج کے شاعر جب کبھی بھوپال آتے تو ہندستان کے دوسرے شعرا کی طرح وہ بھی اختر سعید خاں کے والدِ محترم جناب حامد سعید خاں کے دولت کدے پر حاضر ہوتے اور وہاں سے تازہ اشعار کی سوغات لے کر وطن واپس لوٹتے۔ اس وقت سرونج سے بھوپال آنا جانا اتنا آسان نہ تھا۔ راہ کی صعوبتوں کو یاد کریں تو آسان آج بھی نہیں مگر اب سرونج بھوپال ہی کا ایک محلّہ بن گیا ہے۔ اُن دنوں سرونج اور بھوپال کے درمیان آمد و رفت بہت کم تھی۔ البتہ وہاں مشاعرے بہت ہوتے تھے۔ ادبی ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ ایک مشاعرہ ہی عوامی تفریح کا ذریعہ تھا۔ شعری صاحب اور کیفؔ صاحب وغیرہ سرونج کے مشاعروں میں اکثر تشریف لاتے تھے۔ میں نے وہیں انھیں دیکھا بھی اور سنا بھی۔ محترم اختر سعید خاں کی سرونج آمد مجھے یاد نہیں، اس لیے انھیں دیکھنے کا

اشتیاق زیادہ تھا۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں حصولِ تعلیم کی غرض سے جب میں بھوپال آیا اور یہاں آکر حمیدیہ کالج میں داخلہ لیا تو اختر سعید خاں صاحب کو دیکھنے اور انھیں سننے کی خواہش تیز تر ہوگئی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ بدھوارے کے چوراہے پر مشاعرہ ہے، چنانچہ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ ہم تاخیر سے پہنچے تھے اس لیے ہمیں اسٹیج سے بہت دور صرف کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ ہم کہیں بیٹھ کر بھی مشاعرہ سن سکتے تھے مگر بیٹھ جاتے تو صرف آواز ہی سنتے، اسٹیج اور شعراء حضرات نظر نہیں آتے جبکہ ہم انھیں اور خصوصاً اختر سعید خاں کو دیکھنا بھی چاہتے تھے جن کے تعلق سے حسن و جمال اور وجاہت کے اُن دنوں بڑے چرچے تھے۔ مشاعرے میں خواتین بھی کثرت سے تھیں، جن کا ذوقِ ادب اور شوقِ دید ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم انھیں کے نزدیک کھڑے ہو کر غزلیں سنتے اور غزلوں کے موضوعات کو دیکھتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں اختر سعید خاں کی باری آئی۔ گویا "باغِ نظارہ میں اندر کی سواری آئی" ناظم مشاعرہ نے دعوتِ غزل سرائی کے لیے جیسے ہی ان کا نام لیا، صفِ سامعین میں ایک ہلچل مچ گئی۔ ہم نے دیکھا کہ سفید شیروانی اور سفید چوڑی دار پائجامہ پہنے ایک دراز قامت شاعر اٹھے اور سرو رواں کی طرح چلتے ہوئے مائک کے پاس آکر شائستگی کے ساتھ بیٹھ گئے پھر صدرِ مشاعرہ سے اجازت لے کر مطلع آغاز کیا اور اس مشاعرے کی سب سے کامیاب غزل پڑھی۔ اس غزل کا یہ شعر مجھے آج بھی یاد ہے:

خرامِ ناز مبارک تمھیں مگر یہ دل
متاعِ شیشہ گراں ہے ذرا سنبھل کے چلو

زبان کی شیرینی، بیان کی لطافت' جذبے کا سرور' لہجے کی شوخی اور جسارت'

اور رنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

ادائیگی کا لچکدار انداز ہماری نوعمری' اور ماحول کا حسن' ان سب نے مل ملا کر عجیب رومان پرور فضا قائم کردی تھی۔ ہر طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سامعین کی فرمائش پر اختر سعید خاں صاحب کو یہ شعر کئی بار دہرانا پڑا تھا۔ اس شعر کے ساتھ ایک اور بھی پُر لطف واقعہ ہوا' جس کی یاد ابھی تک باقی ہے۔ اس یاد کا تعلق ایک خاتون کی داد سے ہے۔ وہ ایک ایسی بے ساختہ قسم کی برجستہ داد تھی کہ بھولے نہیں بھولتی۔ ہوا یوں کہ اختر سعید صاحب نے جیسے ہی اپنا یہ شعر ختم کیا

خرامِ ناز مبارک تمھیں مگر یہ دل
متاعِ شیشہ گراں ہے ذرا سنبھل کے چلو

تو داد کے شور کے درمیان ہمارے نزدیک بیٹھی ہوئی ایک خاتون اچانک بول اٹھیں ''ذرا تم بھی سنبھل کے چلو'' اس داد میں کچھ ایسی وارفتگی تھی کہ آس پاس والے سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ ہم بھی انھیں میں تھے۔

اس مشاعرے کے بعد ہم اختر سعید خاں صاحب کے مداحوں کی پہلی صف میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ اپنے ممدوح سے ہماری ملاقات یا رسمی اور غیر رسمی کسی بھی قسم کے تعارف سے پہلے کی بات ہے۔

سیفیہ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی کرم فرمائیوں کی بدولت جن ادیبوں اور شاعروں کو نزدیک سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع ملا ان میں اختر سعید خاں صاحب بھی تھے۔ قوی صاحب کی دعوت پر اختر صاحب سیفیہ کالج کے شعبہ اردو میں تشریف لائے اور ہم طلباء سے باتیں کیں۔ اختر سعید خاں صاحب کی زبان ایسی رسیلی' سجیلی' شگفتہ اور پاکیزہ تھی اور لہجے میں وہ شیرینی' لطافت اور یگانگت تھی کہ ہم سب ان کے گرویدہ ہو گئے۔ میں نے ان میں ایک اور ایسی خوبی بھی دیکھی جو بڑے شعراء میں ذرا کم پائی جاتی ہے۔ بیشتر

اورنگ زیب قاسمی

بڑے شعراء اپنے چھوٹوں کی تعریف سے یا تو گریز کرتے ہیں یا اس میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اختر سعید خاں صاحب کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی میں مبالغہ آمیزی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں میرے کئی تجربے ہیں ان میں سے یہاں صرف ایک کا ذکر کرتا ہوں۔

سیفیہ کالج کے شعبہ اردو میں کسی پاکستانی شاعر کے اعزاز میں شعری نشست تھی۔ اختر سعید صاحب صدارت فرما رہے تھے۔ یہ تقریباً ۲۵ سال پرانی بات ہے۔ میں ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم تھا جیسا کہ آج بھی ہوں۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس وقت مجھے اختر سعید صاحب سے کوئی قربت حاصل نہ تھی۔ میں نے اس نشست میں اپنی ایک تازہ غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

آنکھوں میں دھوپ دل میں حرارت لہو کی تھی
آتش جوان تھا تو قیامت لہو کی تھی

اختر سعید خاں صاحب نے خوب داد دے کر میری ہمت بڑھائی اور میرے اس شعر کی بہت دیر تک تعریف کرتے رہے۔

کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہدِ جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

پھر جب ان سے صدارتی خطبہ اور غزل پڑھنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے حوصلہ افزائی کو اس انتہا پر پہنچا دیا کہ میرے آنسو نکل پڑے۔ اختر بھائی نے کہا۔ خالد محمود کی اس غزل کے بعد پہلے میں اس رسمی نشست کے خاتمے کا اعلان کرتا ہوں، پھر غزل سناتا ہوں۔ ادبی سخاوت' دریا دلی اور ایثار پسندی کا وہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ آج بھی کبھی یاد آجاتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ آج مجھے ان کی

www.urduchannel.in

بہت سی تازہ غزلوں کا پہلا سامع بننے کا اعزاز حاصل ہے اور میں ان کے اس اعتماد پر بھی نازاں ہوں کہ ''کتاب نما'' کو اپنی غزلیں میرے توسط سے ارسال فرماتے ہیں۔ مگر ایک شکایت بھی ہے اور وہ یہ کہ اپنے خطوط میں حوصلہ افزائی کا وہی مبالغہ آمیز طرز اپناتے ہیں جس کا آغاز انھوں نے ۲۵ سال پہلے کیا تھا۔

اختر بھائی کے تعلق سے یہ تاثرات' میرے دلی جذبات کا آئینہ ہیں جنھیں میں نے حالؔی کے ایک شعر میں قدرے تصرف کی جسارت کرتے ہوئے اپنے الفاظ میں ڈھالنے کی ایک ناکام سی کوشش کی ہے۔

پست مضموں ہے، مدحتِ اختر
کس طرح آسماں پہ پہنچاؤں

○○

اورنگ زیب قاسمی

صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں

(۲۹/اگست ۱۹۹۷ء کو پروفیسر صغرا مہدی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شعبہ اردو کے وداعیہ جلسے میں پڑھا گیا خاکہ نما انشائیہ)

لیجیے صغرا آپا بھی وظیفہ یاب ہوگئیں۔ وظیفہ یاب ہم نے جان بوجھ کر لکھا ہے' وہ اس لیے کہ ہم کئی سال سے اس لفظ کو استعمال کرنا چاہتے تھے' مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پچھلے دنوں جامعہ کے حیاتی رکن مجتبیٰ حسین زیدی صاحب (مرحوم) کا سوانحی خاکہ لکھتے ہوئے ایک موقع ہاتھ آیا' اور ہم نے محترم طیب صاحب کی موجودگی میں بآواز بلند لکھا' مجتبیٰ زیدی صاحب جامعہ سے ۱۹۷۲ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔ طیب صاحب نے ہمیں ٹوکا اور فرمایا سبکدوش لکھئے۔ جامعہ میں اس وقت وظیفہ کہاں ملتا تھا، وظیفہ یاب ہوتے۔ ہم نے فوراً اپنی اصلاح کی وظیفہ یاب کاٹ کر سبکدوش لکھ لیا۔ اس لفظ کے معنی بھی ہم پر اسی دن آشکار ہوئے۔ اب چونکہ صغرا آپا کو وظیفہ بھی ملے گا' اس لیے ہمیں ایک بار پھر یہ موقع ہاتھ آ گیا ہے کہ ہم وظیفہ یاب لکھنے کی اپنی حسرت نکال لیں' حالانکہ آج بھی ڈر ہے مبادا' کوئی بزرگ کہہ اٹھیں'

www.urduchannel.in

میاں وظیفہ یاب ہوں' آپ اور آپ کے واحقین اور وظیفہ ملے صغرا کے دشمنوں کو' ہماری صغرا تو اللہ رکھے پنشن پاویں گی۔ صغرا وظیفہ یاب نہیں' پنشن یافتہ ہونے والی ہیں۔ اگر یہاں بھی ایسی نوبت آئی تو ہم چپ چاپ کان دبا کر لکھیں گے کہ صغرا آپا سبکدوش ہوگئیں۔ یوں بھی لفظ وظیفے نے کچھ ایسی شکل وصورت اختیار کر لی ہے کہ اس سے ناداری اور افلاس ٹپکتا ہے، گویا کوئی رحم کھا کر بخشش کر رہا ہو۔ اس کے برعکس لفظ پنشن اپنا حق جتاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اب اس وضاحت کے بعد تو صغرا آپا پنشن یافتہ ہی ہو سکتی ہیں۔

صغرا آپا کے سبکدوش ہونے کا ہم سب کو سچ مچ بہت افسوس ہے' حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ جو ملازم ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن سبکدوش ہونا ہے' اس کے باوجود یقین نہیں آتا کہ صغرا آپا اتنی جلدی سبکدوش ہو جائیں گی۔ ابھی تو ان کے پڑھنے پڑھانے کے دن تھے' مگر انھوں نے بڑی عجلت کی۔ کیا صغرا آپا ساٹھ سال کی ہوگئیں یا یہاں بھی انھوں نے کوئی شرارت کی ہے' ممکن ہے اپنی عمر دس بارہ برس بڑھا چڑھا کر لکھوادی ہو اور سوچا ہو کہ ادبی سرگرمیوں کی طرح اس کام میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، یا عذرا باجی نے کہا ہو' صغرا جب ہم ساٹھ کے ہوگئے تو پھر تم پچاس کی کیوں بنی بیٹھی ہو' چلو ہو جاؤ ساٹھ کی' اور وہ ہوگئیں۔ یوں دیکھا جائے تو صغرا آپا ساٹھ سال کی تو اسی دن ہوگئی تھیں جب ان کے مربی اور مشفق ماموں جان (عابد صاحب) اور ممانی جان (صالحہ آپا) انھیں چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ ناز برداریاں کرنے والے نہ ہوں تو انسان فوراً ساٹھ کا ہو جاتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ صغرا آپا کو دیکھ کر بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ سبکدوش ہونے والی ہیں' انھوں نے سبکدوشی کا کوئی اثر ہی نہیں لیا

ہے۔ ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ ساٹھ سال کی عمر میں سبکدوش ہوتے ہیں۔ تو ان کی شکلوں پر ستر برسنے لگتے ہیں۔ صغرا آپا پچاس کی نظر آنے لگی ہیں۔

پورے شعبے کی خواہش تھی کہ صغرا آپا توسیع لے کر سال دو سال اور ہمارے ساتھ رہیں تاکہ طلبہ کو ان کی محنت' مشقت اور لیاقت نیز ساتھی اساتذہ کو ان کی سخاوت سے جو فیض پہنچتا رہا ہے وہ کچھ دن اور پہنچتا رہے۔ شعبے کو ابھی صغرا آپا کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے رُکنے سے سبھی کا فائدہ تھا' مگر عجیب دستور زمانہ ہے' جن کے رُکنے سے فائدہ ہوتا ہے وہ تو رُکتے نہیں' جن کے جانے سے فائدہ ہوتا ہے وہ رُک جاتے ہیں۔ صغرا آپا بضد ہیں کہ میں تو جاؤں گی' میں کیوں توسیع کا وظیفہ مانگوں' میں ہرگز نہیں مانگوں گی۔ انھیں لاکھ سمجھایئے کہ قانون وقاعدہ بھی تو کوئی چیز ہے' اس کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا مگر ان کا اپنا بھی قانون وقاعدہ ہے اور وہ اس کا لحاظ ضروری سمجھتی ہیں۔

صغرا آپا کے جانے کا مجھے اور میرے ہم عمروں کو ذاتی غم بھی ہے۔ وہ شعبے میں ہماری ایک ایسی دوست بن کر رہیں جس میں بڑی بہن کی شفقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی' کبھی وہ ہم سے لڑتیں' کبھی ہمارے لیے دوسروں سے۔ کبھی ڈانٹتیں کبھی سمجھاتیں' اگر انھیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان سے زیادتی ہوگئی ہے یا کسی کو ضرورت سے زیادہ ڈانٹ دیا ہے تو بے چین ہو جاتیں اور اس وقت تک بے چین رہتیں جب تک کہ اس کی تلافی نہ کر لیں۔ ان کی تلافیاں اکثر بڑی خوش ذائقہ' رسیلی اور خوشبودار ہوتیں' کبھی کبھی گرما گرم نمکین تلافیاں بھی چائے یا کافی کے ساتھ نظر آجاتیں۔ پتا نہیں ان سے جواب طلب کرنے والے پوری تنخواہ کا حساب لیتے ہیں یا نہیں اور اگر حساب لیتے ہیں تو صغرا آپا انھیں کس طرح مطمئن

www.urduchannel.in

ACADEMY

کرتی ہیں۔

صغرا آپا کو اردو، شعبۂ اردو اور اردو کے طلبہ تینوں چیزیں بہت عزیز ہیں۔ تینوں کے وقار، ترقی اور نفع و نقصان کا انھیں ہر وقت خیال رہتا تھا۔ کلاس لینے میں ایسی پابندی کہ موسم کی سختیاں تو کس کھیت کی مولیاں ہیں، انتہائی ناسازگار حالات نے بھی انھیں کلاس لینے سے باز نہیں رکھا۔ طالب علم ایجی ٹیشن کر رہے ہیں، ساتھی طلبہ کو کلاس روم میں جانے سے روکے ہوئے ہیں، اساتذہ کے ساتھ بدتمیزیاں کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایک جارحیت کا عالم ہے، مگر صغرا آپا ہیں کہ کلاس روم میں اپنے طلبہ کو گھیرے بیٹھی ہیں۔ ایجی ٹیشن والے آتے ہیں، روکتے ہیں تو ان کے آگے سینہ سپر ہو جاتی ہیں اور چیخ چیخ کر انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ تم غلطی پر ہو اور تمھیں خبر نہیں کہ تم اپنا کتنا نقصان کر رہے ہو۔ صغرا آپا حق پر ہوں تو کبھی ہار نہیں مانتیں اور اکثر و بیشتر حق پر ہی ہوتی ہیں۔ آفریں صغرا آپا آفریں۔ واقعی آپ کا خلوص، ایثار، حق گوئی، بیباکی سب لائق ستائش اور قابل تقلید ہے مگر یہ سارے کام اتنے مشکل ہیں کہ ان کی تقلید بھی آپ ہی کر سکتی ہیں۔ آپ پر ناطق مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے:

غیر پابندیٔ آئین وفا کیا کرتا
میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

صغرا آپا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں، شوق سے ہو جائیں، شعبہ میں نہیں رہنا چاہتیں نہ رہیں مگر یاد رکھیں شعبے کے باہر بھی ایک دنیا ہے، یہاں آپ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا، باہر کی دنیا میں کیسے چھوڑیں

اورنگ زیب قاسمی

گی۔ دیکھتے ہیں کہاں کہاں سے بھاگتی ہیں۔ آپ اگر آپ ہیں تو ہم بھی ہم ہیں۔

صغرا آپا ناول نگار، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار، سفر نامہ نگار اور اس قدر نگار ہیں کہ ''نگاراں'' بن چکی ہیں۔ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم نے ان کے سفر ناموں پر ایک طویل مضمون قلم بند کیا تھا، جو صغرا آپا نے از راہ حوصلہ افزائی اپنی کتاب ''سیر کر دنیا کی غافل'' میں مقدمہ کے طور پر شامل کر لیا۔ ہم نے اس کتاب کی خوب تشہیر کی۔ ہم چاہتے تھے کہ لوگ اس کتاب کو اس لیے پڑھیں کہ اس میں ہمارا مضمون شامل ہے، کتاب کے پبلشر اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کو شاید ہماری نیت کا پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہمارا مقدمہ کتاب کے آخر میں چھاپا، ہماری وجہ سے یوسف ناظم صاحب جیسے بزرگ کو بھی آخر میں جگہ ملی، اس صورت حال سے یوسف ناظم صاحب نے کیا اثر لیا یہ تو ہمیں نہیں معلوم، مگر ہم نے صبر کر لیا کہ صبر کے علاوہ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا اگر تم جنگل میں اکیلے اور نہتے ہو اور تمھیں شیر مل جائے تو کیا کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا۔ میں تو کچھ بھی نہیں کروں گا جو کچھ کرے گا شیر ہی کرے گا۔ پس شاہد صاحب کے ساتھ ہمارا بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ شاہد صاحب کے مذکورہ عمل کے بعد ہم نے اپنی عزت بچانے کے لیے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش ضرور کی کہ یہ کتاب مع مقدمہ دراصل دیوناگری میں چھپ رہی تھی اور اسی لحاظ سے کتاب کو مرتب کیا گیا تھا یعنی پہلے ہمارا لکھا ہوا مقدمہ، اس کے بعد یوسف ناظم کا لکھا ہوا تعارف، پھر اصل کتاب، مگر اچانک فیصلے نے کروٹ بدلی اور کتاب فارسی رسم الخط میں چھاپ دی گئی۔ جلت میں ترتیب بھی نہیں بدلی جا سکی۔ یوں سب کاروبار

www.urduchannel.in

الٹا ہو گیا۔

صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے، ایک زمانے میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر سے شریر بچے کے کان کاٹتی ہیں' مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہونگ کرتی ہیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے' مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ دونوں خود ہونگ کرتی ہوں' دوسروں کو بھی ہونگ کرنے پر اکساتی رہتی ہیں۔ بھیا ذرا کھڑے ہو کر یہ کہہ دینا' بھیا ذرا وہ کہہ دینا۔ اگر یہ کسی جلسے یا مشاعرے میں پیچھے بیٹھی ہوں تو انھیں آگے بلا لینا چاہیے، ورنہ سامعین کا شعرا کے جذبات و احساسات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس معاملے میں ہم بڑے دور اندیش ہیں۔ ہم نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ میاں اگر شاعری کرنی ہے تو صغرا آپا سے دوستی ضروری ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اب خدا کے فضل سے شاعری اور دوستی دونوں سلامت ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے ایک دانشمندی کا کام یہ کیا کہ از راہ احتیاط صغرا آپا کو کبھی اپنے اشعار ہی نہیں سنائے۔ پتہ نہیں کب ان کی رگِ ظرافت کب پھڑک اٹھے اور دوستی دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے۔

صغرا آپا! آج آپ شعبہ اردو میں اپنی بہترین صلاحیتوں سے خوبصورت یادوں کے ان گنت چراغ روشن کرنے اور خلوص کا چمن مہکانے کے بعد رخصت ہو رہی ہیں۔ آپ سے پہلے بھی اسی طرح لوگ جا چکے ہیں اور آپ کے بعد بھی جائیں گے۔ پہلے جانے والے بھی بہت اچھے تھے اور بعد میں جانے والے بھی ضرور

اچھے ہوں گے کہ سب میں اپنی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں۔ آپ خوبیوں کا شفاف دریا ہیں۔ آج کے بعد شعبے کے در و دیوار آپ کی آواز کو ترسیں گے۔ طلبہ و طالبات اور اساتذہ شدت سے آپ کی کمی محسوس کریں گے۔ آپ طلبہ کے لیے شفیق استاد اور ساتھیوں کے لیے پیکر خلوص و مروت بن کر رہیں۔ ہم سب آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے شعبے کو کبھی نہ بھولیں مگر ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کو ضرور بھول جائیں کہ یہی آپ کی جانب سے ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔

○○

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

ذکر اس پری وَش کا

فلسفی مورخین کو شبلی (اعظمی) نعمانی' ترقی پسندوں کو کیفی اعظمی' مشاعرہ بازوں کو ساغر اعظمی اور فلم بینوں کو شبانہ اعظمی مبارک ! ہماری نگاہِ کوتاہ بیں عبداللطیف اعظمی سے اوپر نہیں اٹھتی۔ ''انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' والا معاملہ ہے۔

دراصل عبداللطیف اعظمی صرف ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک ادارہ' ایک انجمن' ایک مکتبہ تحقیق' ایک تحریک' ایک آندھی اور ایک طوفان کا نام ہے۔ قارئین و سامعین، میں نے یہ باتیں از راہ لطافت یا از راہ تذکرہ نہیں کہی ہیں بلکہ اپنے ان دعووں کے ثبوت کے لیے مضبوط دلائل سے بھی آراستہ و پیراستہ ہوں۔ میرے منطقی استدلال جن پر فلسفے کے اثرات کا غلبہ ہے' لطیف صاحب سے منسلک کیے گئے انسلاکات کی تصدیق و تائید کریں گے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے لطیف صاحب کو سب سے پہلے ایک ادارہ کہا ہے' جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ادارہ ہے۔ جامعہ ملیہ کو ادارہ بنانے میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں اور اسے ادارہ بنائے رکھنے

اورنگ زیب قاسمی

میں ڈاکٹر ذاکر حسین' پروفیسر محمد مجیب' ڈاکٹر عابد حسین اور شفیق الرحمن قدوائی جیسی ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ تمام حضرات جامعہ میں رہے تو جامعہ ادارہ بنا۔ میری دلیل یہ ہے کہ یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں' لیکن لطیف صاحب کے اندرون میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں' ان حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں۔ جامعہ ملیہ میں یہ آٹھ دس افراد بیک وقت کبھی نہ رہے ہوں گے، مگر ان کی محبت نے لطیف صاحب کو ایک مستقل ادارہ بنا دیا ہے۔ ماس کمیونی کیشن جیسے بعض شعبے ممکن ہے لطیف صاحب اپنے ''ادارہ'' میں نہ کھول سکے ہوں کہ یہ ان کی یادوں کے نہاں خانے میں نہیں بلکہ عیاں خانے کا ایک حصہ ہیں' پھر لطیف صاحب کا ذوق بھی مختلف ہے' اس لیے ماس کمیونی کیشن کی جگہ کمیونی کیشن کے چند شعبہ جات لطیف صاحب نے اپنے اندر کے ادارہ میں قائم کر رکھے ہیں' اور یہ ان کے اندر کی صنعت تضاد ہے کہ مختلف الخیال اور متضاد المزاج حضرات کو اپنے اندر کے ادارے میں یکجا کرنے کے بعد خود اس کے ''شیخ الادارہ'' بنے بیٹھے ہیں۔ جامعہ میں تو خود لطیف صاحب وی۔ سی۔ کے پی اے تھے۔ وہاں سب پی اے ہیں۔ میرے ان روشن دلائل سے لطیف صاحب کی ادارگی یا اداریت ثابت ہو جاتی ہے اور اس مسئلے پر اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی' اختلاف صرف اس نکتہ پر ہو سکتا ہے کہ لطیف صاحب خود بلا شرکت غیرے ان حضرات پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں یا انھوں نے لطیف صاحب کو دبوچ رکھا ہے۔

دوسری نسبت انجمن سے ہے۔ میرے اس انتساب کا سب سے بڑا ثبوت لطیف صاحب کی شخصیت اور تکلم ہے۔ آپ یقین کیجیے' انجمنِ ناز کی ناز آرائی سے انجمن اساتذہ کی معرکہ آرائی تک سارے کے سارے گر لطیف صاحب اچھی

www.urduchannel.in

طرح جانتے ہیں۔ مثلاً آج کل کی انجمنیں اپنی بات منوانے کے لیے قوت بازو کا سہارا لیتی ہیں۔ لطیف صاحب قوت زبان سے کام لیتے ہیں اور دوران گفتگو پینترے بدل بدل کر ایسے حملے اور جوابی حملے کرتے ہیں اور دلائل کا وہ نیوکلیائی اسلحہ استعمال کرتے ہیں کہ ہٹلر کے اچھے دور کی نبرد آزمائیاں اور مسلمان بادشاہوں کے بُرے وقتوں کی ''کا بکی معرکہ آرائیاں'' آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں اور حریف کی آئی سائٹ اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ راہ فرار نظر نہیں آتی۔ لڑائی یک رخی ہو کہ چومکھی، بحث میں لطیف صاحب کو شکست دینا باکسنگ میں محمد علی کلے، ایکٹنگ میں دلیپ کمار اور کرکٹ میں سچن تینڈولکر کو شکست دینے کے مترادف ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ لطیف صاحب ہر موضوع پر ہفتوں اور بعض موضوعات پر مہینوں بول سکتے ہیں اور برسوں سے بولتے چلے آ رہے ہیں۔ دوران بحث پانی بھی نہیں مانگتے، اُلٹا حریف کو پانی مانگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

نسبت نمبر تین میں انھیں مکتبۂ تحقیق کہا گیا ہے۔ کہتے ہیں مکتبہ کا تعلق کتابوں سے ہوتا ہے۔ لطیف صاحب کی یادداشت اور گھر کی الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں، جبکہ ان گھروں میں جہاں لطیف صاحب کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہے، الماریاں کتابوں سے خالی ہو چکی ہیں۔ سنتے ہیں قدیم زمانے میں شہزادے یا راجکمار جہاں سے گزرتے تھے، شریف لوگ اپنی بہو بیٹیاں چھپا لیا کرتے تھے، لطیف صاحب گزرتے ہیں تو شریف لوگ اپنی کتابیں چھپا لیتے ہیں۔ تحقیق کے سلسلے میں بھی لطیف صاحب کا یہی رویہ ہے۔ تاریخ پیدائش سے متعلق پیدا ہونے والے شخص کا دعوا بھی غلط ثابت کر دکھاتے ہیں، اگر آپ بدقسمتی سے ادیب یا شاعر واقع ہوئے ہیں، تو ان کی چاہے جتنی خوشامد کریں، لاکھ قسمیں کھا کر اپنی پیدائش کی تاریخ کا یقین دلانا چاہیں، مگر لطیف صاحب کے پتھر دل پر ذرا اثر نہیں ہوگا۔ وہ

انتہائی محتاط قسم کے محقق ہیں، تاریخ ولادت کی تصدیق کے لیے صاحب ولادت کے والدین کا نکاح نامہ طلب کر لیتے ہیں، کبھی اس قسم کی دلیل لاتے ہیں کہ فلاں ادیب کی بائیں آنکھ میں دائیں جانب سرخ رنگ کا تل ہے اور ایسے لوگ دسمبر کی پندرہ سے پچیس تاریخ کے درمیان پیدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر خدانخواستہ کسی ایسے شخص کے میونسپل کاغذات، ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور اسکول کی سند یا خود موصوف یعنی صاحب ولادت، دسمبر میں پیدا ہونے کا دعویٰ کریں، تو لطیف صاحب ان کی پچھلی سات پشتوں اور آئندہ سات نسلوں کو دسمبر میں پیدا نہ ہونے دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ احتیاط نہ برتی جائے تو پھر میونسپل کارپوریشن اور ایک محقق میں کیا فرق رہ جائے گا۔ معلوم کو نامعلوم اور نامعلوم کو معلوم، موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود یعنی اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر کرنا تحقیق کا کام ہے، سو وہ کرتی رہے گی۔ میونسپل بورڈ اور ڈاکٹر ایک عام آدمی کو اپنی مرضی کے مطابق پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شاعر اور ادیب کی زندگی اور موت لطیف صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جب اور جہاں چاہیں پیدا کریں، جس تاریخ کو چاہیں مار دیں۔ نہ جانے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی پیدائش اور وفات کے معاملے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لطیف صاحب کی موجودگی میں، نہ کوئی سکون سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ چین سے مر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے قیامت کے دن تاریخ وفات کے اندراجات پر ملک الموت سے ان کا جھگڑا قیامت کے میدان کو پانی پت کا میدان بنا دے گا اور وہاں مقدمے والے حاتی بھی بے بس نظر آئیں گے۔

ان کو ایک نسبت تحریک سے بھی ہے۔ جن صاحبان نے لطیف صاحب کو متحرک دیکھا ہے وہ اس نسبت پر کسی ثبوت کے طالب نہ ہوں گے۔ میں نے ''کبک دری'' کو اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے نہیں دیکھا، اس کی چال کے

اورنگ زیب فلسی

www.urduchannel.in

بارے میں صرف شاعروں سے سنا ہے۔ اگر کسی صاحب نے اس کی چال بچشم خود دیکھی ہے تو براہ کرم لطیف صاحب کی رفتار بھی دیکھ لیں یا مجھے ''کبک دری'' کی چال دکھادیں' بغیر دیکھے قیاس آرائی کرنا تحقیق کے دائرے کی چیز ہو جائے گی اور میں لطیف صاحب کی برابری کے تصور سے بھی خائف ہوں۔ بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ لطیف صاحب جب متحرک ہوتے ہیں تو سراپا تحریک نظر آتے ہیں، بلکہ دیکھنے والوں میں بھی تحریک پیدا کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر سکنڈوں لطیف صاحب کو چلتے دیکھا ہے۔ سیکنڈوں اس لیے کہ لطیف صاحب چلتے وقت سیکنڈوں سے زیادہ نظر ہی نہیں آتے۔ وہ تو بس ایک چھلاوا ہیں' چشم زدن میں اپنے گھر سے اردو گھر (جسے وہ اپنا ہی گھر سمجھتے ہیں) اردو گھر سے جامع مسجد اور جامع مسجد سے مکتبہ جامعہ پہنچ جاتے ہیں۔ اگر آپ نے انھیں غالب اکیڈمی میں چائے پیتے دیکھا ہے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد یا اسی وقت ایوان غالب کے کسی فنکشن میں بسکٹ کھاتے نظر آ جائیں تو حیرت زدہ یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں' اس لیے کہ انھیں ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر دیکھے جانے کے کئی ثبوت ملتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

لطیف صاحب کی تحریک سے مناسبت کا ذکر سن کر بعض ناعاقبت اندیش انھیں تحریک ولی الٰہی یا ترقی پسند تحریک قسم کی کوئی چیز سمجھے ہوں گے' تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کی نہ جانے کتنی تحریکیں لطیف صاحب چائے میں گھول کر پی چکے ہیں۔ ان کی تحریک، حرکت سے مستعار ہے' خواہ وہ حرکت پیروں کی ہو جس کے سلسلے میں اوپر خاطر خواہ بحث ہو چکی ہے یا جسم کے کسی اور حصے، بالخصوص زبان کی ہو' ان کی تحریک بہرحال حرکت سے مستعار ہے۔ مذہبی' سیاسی یا ادبی مسئلہ پر گل افشانی گفتار کی خاطر' جب لطیف صاحب اپنی زبان کو حرکت میں لاتے ہیں تو

ان کے پُرزور دلائل اور پُرشور جذبات کے بہاؤ میں ہر قسم کی تمام مخالفتیں اور اعتراضات تنکوں کی طرح بہتے نظر آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لطیف صاحب خدانخواستہ ہمہ وقت غیظ و غضب میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ لطیف صاحب تو مجموعی طور پر اسم با مسمّیٰ ہیں۔ ہر وقت چھیڑ چھاڑ' خوش گپیاں' خوش فعلیاں' شوخی اور شرارت گویا ان کا مزاج بن گیا ہے۔ لطیف صاحب کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے' سوائے اس بات کے جسے وہ لطیفہ کہہ کر سناتے ہیں۔

جامعہ برادری میں لطیف صاحب اپنے ہم عمروں کے علاوہ چھوٹوں اور بڑوں سے بھی جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اس خصلت نے انھیں حضرات ہی میں نہیں، خواتین میں بھی خاصا مقبول بنا دیا ہے۔ وہ سب کو چھیڑتے ہیں' سب انھیں چھیڑتے ہیں اور یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ لطیف صاحب جامعہ کی روایات کے اس حد تک امین ہیں کہ انھوں نے جامعہ کی ساری امانتیں اپنے پاس محفوظ کر لی ہیں تاکہ خیانت کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔

اب رہے آندھی طوفان کے الزامات، تو وہ میں نے بس یوں ہی از راہ مذاق کہہ دیا ہوگا، ورنہ لطیف صاحب تو صبا اور موجِ نسیم ہیں، بشرطیکہ آپ ان سے کسی معاملے میں اڑنے یا اڑنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آندھی اور طوفان بھی صبا اور نسیم کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

○○

اورنگ زیب فلسی

www.urduchannel.in

"خالد محمود کا مطالعہ وسیع ہے۔ ہر اچھی اور معیاری تصنیف خواہ وہ تخلیق ہو یا تحقیق وتنقید، وہ اپنی ذاتی لائبریری کے لیے قیمتاً حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں بغور پڑھتے بھی ہیں۔ ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ سیمینار کے مقالوں کی تیاری بہت محنت سے کرتے ہیں، البذا اکثر یونیورسٹیز اور اکادمیوں میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں خصوصیت سے مدعو کیے جاتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ داد ملتی ہیں۔ اور N.C.E.R.T. کا کوئی Work Shop ان کے بغیر ہوتا نہیں۔ کیونکہ یہ نصابی کتب کی ترتیب اور تدوین میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔"

—— ڈاکٹر شفیقہ فرحت

عزیزی

(ڈاکٹر عزیز اندوری کا ایک مختصر خاکہ)

ممکن ہے مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہو کہ اندور کی دو چیزیں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو اندوری توس (پاپے) اور دوسرے عزیز اندوری۔ یوں تو اندور میں مظفر اندوری، راحت اندوری، نور اندوری اور بہت سے اندوری موجود ہیں مگر عزیز اندوری کی بات الگ ہے۔ اندور کے توس (پاپے) چائے میں بھگو کر کھائے جاتے ہیں۔ چائے میں بھیگنے کے بعد ان توسوں یا پاپوں کی شکل دیکھ کر عزیز اندوری بہت یاد آتے ہیں۔

عزیز کبھی دہلی میں تھے۔ وہاں بھی اندوری بن کر رہے اور خوب رہے۔ پھر ان پر نام کا لاحقہ ایسا لاحق ہوا کہ آج تک اندور سے ملحق ہیں۔ دہلی نے انھیں برباد و بدنام کیا اور اندور کو خود انھوں نے، لیکن یہ بدنامی بھی بڑی نام والی نکلی۔ "جو ہے نام والا وہی تو بدنام ہے۔"

ان کے ادبی مشاغل، اقتصادی مشاغل اور دلچسپ مشاغل ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انھوں نے بہت لکھا مگر دوسروں کے لیے زیادہ، اپنے لیے کم۔ مختلف ناموں سے لکھے ہوئے نہ جانے کتنے مقالے آپ نے بھی پڑھے ہوں

www.urduchannel.in

گے اور آپ کو خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ یہ عزیز اندوری کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ مصحفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے بے شمار شاگردوں کو غزلیں لکھ کر دیا کرتے تھے' اس سخاوت کے دوران اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ اچھی غزلیں شاگردوں کو دے دیں اور کمزور خود رکھ لیں۔ عزیز اندوری بھی اپنے عہد کے مصحفی ہیں۔ ان کی شاعری تو خیر کوئی کیا لیتا' البتہ نثر میں انھوں نے وہ ایثار دکھایا کہ مصحفی کو بھی شرمندہ کر دیا۔ اچھی تحریریں دوسروں کو دے کر کمزور تحریریں خود رکھ لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اسلام نے کہا ہے جو چیز تم اپنے لیے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرو، اس معاملے میں عزیز اندوری نے اسلام کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

عزیز اندوری کے بہت سے پلس پوائنٹس ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ عزیز ہیں' سب کو عزیز۔ مخلص ہیں، انتہائی مخلص۔ دوست دشمن دونوں کے دوست ہیں۔ مگر سب سے بڑا پلس پوائنٹ ان کی بیگم ہیں۔ اللہ میاں نے انھیں ایسی نیک' صابر و شاکر اور سلیقہ شعار بیوی دی ہے کہ رشک آتا ہے۔ اللہ میاں کے معاملات انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ عزیز اندوری جیسے کو ایسی بیوی دے دیتے ہیں اور جو عزیز اندوری جیسے نہیں ہوتے انھیں ویسی بیوی دیتے ہیں' خدا کی مشیت خدا ہی جانے۔ ممکن ہے یہ عزیز اندوری کے ایثارِ تحریر کا نتیجہ ہو یا ممکن ہے اللہ میاں، بھابی کا امتحان لینا چاہتے ہوں، یا ممکن ہے سہواً..... نعوذ باللہ..... سہو تو صرف انسانوں سے سرزد ہوتا ہے۔ مگر بھابی کے والدین بھی تو انسان ہی تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

"..... سرونج کے ان نوجوانوں میں جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے مراحل اپنی محنت' لگن اور قوتِ بازو کے سہارے طے کیے' خالد محمود کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے ہے، جس نے مہمان نوازی اور یار باشی میں سب کچھ لٹا دیا، پھر بھی آنکھ میلی نہیں ہوئی، بلکہ جتنا انہوں نے خرچ کیا اتنے ہی خوش ہوئے۔ خالد محمود کی دہلی کی زندگی، مہمان نوازی کے سلسلے میں اتنی زیادہ قابلِ ذکر نہیں (کہ اب وہ معاشی طور پر اس قابل ہیں) لیکن جب معاشی تنگدستی تھی اور وہ چھوٹی موٹی ملازمتوں یا ٹیوشن کے ذریعہ زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے اور اپنی تعلیم کا سنگلاخ میدان طے کر رہے تھے، ان کی یار باشی، احباب نوازی اور مہمانوں کی خاطر تواضع عروج پر تھی۔ میں خود اس کا چشم دید گواہ ہوں۔....."

——ڈاکٹر شان فخری

www.urduchannel.in

سٹی بس کا سفر

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دلّی میں ابھی ہم نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ شہر بھوپال میں چلنے والی سرکاری اور نیم سرکاری بسیں اپنا وقار کھو چکی تھیں اور نئی نئی پرائیویٹ بسوں نے ان کی جگہ لے لی تھی، اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھوپال کی چمکتی ہوئی نئی پرائیویٹ بسوں کے مروّت دار کنڈکٹروں کا مہذب برتاؤ ہماری رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ ان شائستہ کنڈکٹروں میں بڑی پاسداری تھی۔ وہ سواریوں کی عزّت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ جب تک ان کی بس کا ایک ایک مسافر بس میں سوار ہو کر اس قدر اطمینان سے نہ بیٹھ جائے کہ اس کے اطمینان پر بے اطمینانی کا گمان گزرنے لگے' ڈرائیور اور کنڈکٹر بس سے نیچے اُترے کھڑے رہتے ہیں۔ مجال ہے کہ مسافروں سے پہلے بس کے اندر قدم بھی رکھ لیں۔ سوء اتفاق سے اگر وہ بس کے اندر پہلے سے موجود ہیں، تو اس وقت تک بس کو آگے نہ بڑھائیں گے جب تک کہ مسافر بس سے اتر کر پیدل چلنے کی پوزیشن میں نہ آ جائیں۔

مسافروں کو بھی حالات نے اتنی عقل دے رکھی ہے کہ اگر کسی نجی اور فوری کام سے جانا ہے تو سٹی بس کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے چہل قدمی کرتے

اورنگ زیب قاسمی

ہوئے آرام سے چلے جاتے ہیں۔ سرکاری کاموں کے لیے البتہ یہ بسیں نہایت موزوں اور مناسب ذریعۂ آمد و رفت ہیں۔ بھوپال کی سٹی بسوں کے کنڈکٹروں کو ''پیاسا خود کنویں کے پاس جاتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔'' والے مقولے کی حرمت کا اس قدر پاس رہتا ہے کہ بنفس نفیس ہر مسافر کے پاس پہنچ کر ٹکٹ دیتے ہیں۔

میں چشم دید گواہ ہوں کہ ایسے ہی ایک موقع پر جب کنڈکٹر نے سب کے ٹکٹ کاٹ دیے تو بس کو چلنے کی سیٹی بجائی، لیکن بس ابھی چلنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سامنے سے ایک مسافر نما شخص تیز قدم آتا دکھائی دیا۔ اب ڈرائیور کی شرافت نفس دیکھئے' سوچا شاید بس میں بیٹھنا چاہتا ہے' چنانچہ بس روک دی گئی۔ دور سے آنے والا قریب پہنچا تو اس کا چہرہ سمجھ دار قسم کے انسانوں جیسا نکل آیا۔ نتیجتاً وہ بس کے قریب سے تیزی کے ساتھ نکلتا چلا گیا۔ کنڈکٹر نے گھریلو زبان میں ایک دو باتیں کہیں اور بس اب واقعی چل پڑی' پھر رُکی' پھر چلی پھر رُکی پھر چلی۔ اس طرح ایک بس اسٹاپ سے دوسرے بس اسٹاپ کے درمیان دس بارہ نئے بس اسٹاپ تعمیر کرتی' راہ گیروں کو سلام کرتی، رُک رُک کر دعوت نشست دیتی' منزل کی جانب (جس کی آج تک انکوائری نہ ہو سکی) روانہ ہوئی۔ راستہ میں کچھ محتاط قسم کے دور اندیش لوگ حفظ ماتقدم کے طور پر بس میں سوار ہو گئے مبادا بس والے انتقامی کارروائی کر بیٹھیں۔

بھوپال کی سٹی بس میں سفر کرنے والوں کو بس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر صاحبان کے علم قیافہ میں مہارت کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ یقین جانئے دور سے دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں شخص ایک گھنٹے یا آدھے گھنٹے بعد بس میں ضرور سوار

www.urduchannel.in

ہوگا۔ پھر اگر موڈ ہوا تو آدھا گھنٹہ بس اس کے پیچھے لگائے رہیں گے۔ ورنہ کسی جگہ روک کر انتظار کرلیں گے' اور آپ کو تعجب ہوگا جس شخص کے بارے میں ڈرائیور قیاس کرتا ہے' وہ شخص ایک نہ ایک دن بس میں ضرور سوار ہوتا ہے۔ ہر ہر قدم پر ڈرائیور اور کنڈکٹر کی قوت ارادی اور مسافروں کی قوت برداشت کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ تھا وہ قابل رشک قسم کا لائق ستائش ماحول جس کے اثرات ہماری رگ وپے میں سرایت کر چکے تھے۔

اس کے بعد جب ہم نے دہلی میں پہلی بار قدم رنجہ فرمایا تو ہمارے ہاتھ میں سفر کی ایک جیتی جاگتی علامت یعنی سوٹ کیس بھی تھا' اس کے باوجود جب ایک سٹی بس ہمارے قریب سے گزرنے لگی تو ہم نے ازراہ احتیاط دوسرے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ بھی کردیا کہ شاید ڈرائیور کی نظر ہمارے سوٹ کیس پر نہ پڑے۔ جبکہ بھوپال میں سوٹ کیس ساتھ میں ہو، تو بس کو روکنے کا اشارہ کرنا ڈرائیور کی توہین ہے۔ لیکن اے لوگو! کیا تمھیں یقین آجائے گا کہ بس بالکل نہیں رکی اور ایک مسافر کے پاس سے اسی طرح نکلی چلی گئی' جس طرح بھوپال میں بس کے قریب سے مسافر نکلا چلا جاتا ہے۔ ڈرائیور کی اس ناقدرشناسی پر ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ اپنے ملک کا ایک وفادار اور ہمدرد شہری ہونے کے ناطے یہ احساس بھی ہوا کہ بس والوں کے اس رویے سے ملک کی اقتصادیات پر کس قدر منفی اثر پڑے گا۔

بہرحال گرتے پڑتے ہم اس محشرستان تک پہنچے جسے دہلی والے بس اسٹاپ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوا جیسے یہاں برسوں سے کوئی بس نہ آئی ہو۔ لیکن بہت جلد یہ خیال غلط ثابت ہوگیا اور ہمارے دیکھتے

ہی دیکھتے سو پچاس بسیں آئیں بھی اور گزر بھی گئیں البتہ لوگوں کی تعداد میں کمی واقع نہ ہوسکی۔ جب بھی کوئی بس آتی لوگ پاگلوں کی طرح دوڑتے' کچھ اس کا نمبر دیکھ کر اپنی جگہ پر واپس آجاتے اور کچھ اناج کے بوروں کی طرح اپنے آپ کو اس میں ٹھونس لینے یا لٹکا لینے میں کامیاب ہوجاتے۔

اس عمل سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ دلی میں قطار میں کھڑے ہونے کا رواج نہیں۔ رواج یقیناً ہے' جب تک بس نہیں آتی' لوگ نہایت صبر وسکون کے ساتھ صف بہ صف کھڑے رہتے ہیں' پھر جیسے ہی بس پر نظر پڑی' پتھروں کے زمانے کی تہذیب جاگ اٹھتی ہے' کہتے ہیں زمانے کے فرق کے باوجود مہذب لوگ قدیم تہذیب سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑتے۔ مساوات کا یہ عالم کہ محمود وایاز بس کے ایک ہی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی دروازے سے نیچے اترتے ہیں۔

دلی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن بھی خوب آتا ہے' بس میں نقب لگا کر داخل ہوجاتے ہیں۔ دلی کے رکشاوالوں کے بارے میں مشہور ہے کہ جہاں سے ان کے رکشے کا صرف اگلا پہیا گزر جائے پورا رکشا گزار دیتے ہیں۔ دریا گنج میں بالعموم اور چتلی قبر' جامع مسجد' چاندنی چوک میں بالخصوص راہ گیروں کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے پورے پورے رکشوں کے گزرنے کے مناظر آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہی حال سٹی بسوں میں سوار ہونے والے جیالوں کا ہے۔ بس پر چڑھنے میں مدد کرنے والا ڈنڈا اگر ان کے ہاتھ میں آگیا تو سوئی کے ناکے برابر جگہ سے بھی اپنے آپ کو نکال دیں گے اور اس کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ یوں بھی سرکاری سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

اترنے والوں کی فکر کم ہی رہتی ہے۔ مسافر اترنے بھی نہیں پاتے کہ بس آگے بڑھ جاتی ہے۔ لوگ اترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو۔ بار بار بس میں سوار ہونے اور اترنے کی بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ قیمتی سوٹ اور ٹائی والے وجیہہ اور پُر وقار آفیسر، قیمتی ساڑیوں والی ہر سائز اور ہر رنگ کی خواتین، کالج کی تیز طرار لڑکیاں، نوجوان ہیرو شیروانی پاجامے اور سرخ و سپید ریش والے بزرگ، علماء، برقع پوش مستورات، کم عمر بچے، شریف، نیک، معصوم، نیز چور اچکے، بدمعاش، جیب کترے، غرض ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ہر طرح کے لوگ ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہوتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ دلی میں لوگ زندگی کا بڑا حصہ بس کے انتظار میں گزارتے ہیں۔

ہم بھی عرصہ دراز سے ایک بس کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے بس آئی، ہم آگے بڑھے، ساتھ ہی بھیڑ میں ایک خاتون بہتی ہوئی آگے چلی آئیں۔ ہم بھوپال کی تہذیب کے پروردہ، سوچا پہلے انھیں سوار ہونے دیں، اس خیال نے ایک لمحے کو قدم روک دیئے، خاتون ہمیں دھکا دے کر بس میں سوار ہو گئیں، بس بھاگ گئی اور ہم کھڑے کھڑے غبار دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسری بس کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔

اس بار ہم نمبر دیکھے بغیر آگے بڑھے، پیچھے سے مسافروں کا ایسا ریلا آیا کہ ہم بغیر کسی کوشش کے بس کے قریب ہوتے چلے گئے۔ قریب پہنچ کر کنڈکٹر سے معلوم ہوا کہ یہ ہماری بس نہیں ہے، پیچھے پلٹنے کی کوشش نے سعی لاحاصل کا پریکٹیکل کرا دیا۔ پیچھے والوں نے اتنے زور سے دھکا مارا کہ باہر نکلنے کی جدوجہد میں بس

کے قریب اور دوسرے ریلے کے ساتھ بس کے اندر تھے۔ دلی میں عام طور پر لوگ اسی طرح بسوں میں سوار ہوتے ہیں۔ بس کے اندر کی شان یہ ہے کہ ڈی ٹی سی کا کنڈکٹر مہاراجا ہے۔ پچھلے دروازے کے پاس سیٹ پر جلوہ افروز رہتا ہے۔ اس کو سلامی دیجئے پھر آگے بڑھئے۔ لیکن ہم تو اس کے عادی نہ تھے۔ اطمینان سے آگے نکلے چلے گئے۔ سوچا کنڈکٹر کو غرض ہوگی تو خود ٹکٹ لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہوگا۔

اب سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں اترنا ہے اور بس کہاں تک جائے گی، سب کچھ تاریکی میں تھا۔ بس میں سوار ہوتے وقت اتنا یاد تھا کہ اس کا منہ ہماری منزل کی طرف ہے اور بس۔ بس چلتی رہی، چلتی رہی، لوگ سوار ہوتے رہے۔ بیٹھتے اترتے رہے۔ ہم نے بھی کئی بار بیٹھنے کا ارادہ کیا، جہاں کھڑے تھے، اس کے قریب کئی مرتبہ سیٹ بھی خالی ہوئی۔ لیکن جب بھی ہم نے بیٹھنے کی کوشش کی، وہاں کسی دوسرے کو بیٹھا ہوا پایا۔ ہم حیران و پریشان تھے کہ یا خدا اس قدر دور کھڑے ہوئے افراد اس سیٹ پر جس سے ہم عرصہ ہوا چپکے کھڑے ہوئے ہیں، ہم سے پہلے کس طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ آتش کی محفل تو ہم نے دیکھی نہیں مگر اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں سیٹ ڈھونڈتا ہی سٹی بس میں رہ گیا

ہاں تو قارئین باتمکین! میں عرض کر رہا تھا کہ بس چلتی رہی، چلتی رہی، ہم آشرم سے سوار ہوئے تھے بلکہ کئے گئے تھے اور جامعہ نگر ہماری منزل تھی مگر بس

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

نے ہمیں صفدر جنگ پہنچا دیا (جو حضرات آشرم، جامعہ نگر اور صفدر جنگ کے فاصلوں سے واقف ہی نہیں وہ ہماری بے کسی اور بے بسی کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں)۔ قسمت پر شاکر ہو کر بس سے اترے ہی تھے کہ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ طلب کیا اور ٹکٹ کی عدم موجودگی میں مبلغ دس روپے سکہ رائج الوقت کا مطالبہ کیا۔ ہم نے لاکھ سر مارا کہ کنڈکٹر نے جب ٹکٹ دیا ہی نہیں تو ہمارا کیا قصور۔ مگر وہ ظالم ٹس سے مس نہ ہوا 'قہر درویش بر جان درویش' یہ صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔

ایک واقعہ یاد آیا۔ کچھ احباب کے ساتھ سٹی بس میں سوار تھے۔ دو اشخاص والی ایک سیٹ پر دو اشخاص ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاؤں کی تکلیف کے اظہار پر ایک شخص نے از راہ عنایت، کسمسا کر اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اور اپنی دانست میں سیٹ پر جگہ دیتے ہوئے ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حسب معمول بھیڑ اپنے شباب پر تھی۔ ہم اس جگہ کو غور سے دیکھ رہے تھے، جو ان کے سمٹنے اور کھسکنے پر نیچے سے نکلنے والی تھی۔ ان کی ان تھک کوشش کے بعد، سیٹ کی ایک چار انچی لکیر، پہلی رات کے چاند کی طرح، نمودار ہوئی اور ہم یہ سوچ کر اس پر بیٹھنے کی پوزیشن میں آ گئے کہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس جگہ کو بیٹھنے کے قابل بنا لیں گے۔

مگر اب حالت یہ تھی کہ وہ جگہ تو بیٹھنے کے قابل کیا بنتی ہم اٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ کچھ لوگ اس طرح ہم پر جھک گئے تھے کہ ہم جنبش کرنے سے محتاج ہو گئے۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح اٹکے ہوئے گزرے ہوں گے کہ ایک کرم فرما کی آواز کان میں آئی۔ موصوف ہمارا نام لے کر فرما رہے تھے 'ارے بھئی انھیں تو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ اس آواز نے گویا ہمارے کانوں میں گرم سیسا انڈیل دیا اور

غصے کی طاقت کے تعاون سے ہم ایک جھٹکے کے ساتھ اس جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، جہاں سے اٹھنے کی لمحہ اول سے کوشش کر رہے تھے۔

ایشیاڈ میں کھلاڑیوں کو سہولت پہنچانے والی میٹاڈوروں نے سٹی بسوں کا روپ دھارن کر کے دلی کے غریب مسافروں کی عزت کے ساتھ جو کھلواڑ کی ہے اس کی کہانی ایسی عبرت ناک ہے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ذرا تصور کیجیے کہ ایک چھوٹی سی بس میں جس کی چھت کی اونچائی بیٹھے ہوئے مسافروں کے سر سے خوش فعلیاں کرتی ہو، طویل جسیم و ضخیم، مسافر کھڑے ہو کر کیونکر سفر کرتے ہوں گے؟ وہ بھی ایسی صورت میں کہ آس پاس کی سیٹیں بیٹھے ہوئے مسافروں سے بھری ہوں، خود ان پر اور ان سے زیادہ بیٹھے ہوئے لوگوں پر کیا کیا نہ گزرتی ہوگی۔ یہ مسئلہ بعضوں کے نزدیک تہذیبی اور بعضوں کے نزدیک اخلاقی ہے، اس لیے اس گفتگو کو آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے عرض ہے کہ اس قبیل کے سیکڑوں واقعات دلی کی سٹی بسوں میں روز کا معمول ہیں۔ چنانچہ ہم نے خیال کیا کہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں دلی کی سٹی بسوں کے سفر سے متعلق چند فنون اور آداب، از راہ نوازش آپ کو بھی سکھا دیں تا کہ سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔

نمبر ۱: بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے کا فن:

اس سلسلے میں عرض ہے کہ سب سے پہلے بس اسٹاپ پر لگی ہوئی تختی میں اپنی بس کا نمبر پڑھ لیجیے۔ لیکن یاد رکھیے یہ ضروری نہیں کہ ہر بس اسٹاپ پر تختی بھی لگی ہو۔ اگر تختی لگی ہے اور اس تختی پر بہت سارے نمبر بھی لکھے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ

www.urduchannel.in

ان سارے نمبروں کی بسیں اس بس اسٹاپ پر آجائیں گی اور آگئیں تو یہ ضروری نہیں کہ رک جائیں گی اور رک گئیں تو پھر یہ ضروری نہیں کہ آپ سوار ہو جائیں گے۔ دلّی کی سٹی بسوں کا تمام سفر یعنی اسٹاپ پر بس کی آمد اور آپ کا اس میں سوار ہو کر منزل مقصود پر پہنچنا کرکٹ کے کھیل کی طرح ''بائی چانس'' ہوتا ہے۔

بس کا ڈرائیور جوان ہے تو لڑکیوں کے پاس کھڑے ہونے کی کوشش کیجئے اور بوڑھا ہو تو کہیں بھی کھڑے ہو جایئے، لیکن بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ بس اپنے اسٹاپ پر ہی رکے گی۔ وہ قطعی طور پر آزاد ہے۔ اسٹاپ سے بہت آگے اور بہت پہلے کہیں بھی رک سکتی ہے۔

نمبر۲: بس میں سوار ہونے کا فن

اسٹاپ پر بس آتے ہی کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مجمع کے آگے پہنچانے کی کوشش کیجئے اور آگے پہنچنے پر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیجئے۔ اب آپ کی ذمہ داری ختم، پیچھے والے آپ کو بس میں سوار کرائیں گے۔ ابتدا میں یہ عمل آپ کو عجیب سا لگے گا۔ آپ اچھلیں گے، کودیں گے، کسی کو ڈانٹیں گے، کبھی چہرہ غصے یا حیا سے سرخ ہو جائے گا۔ کبھی گھبرا کر چیخ اٹھیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ آپ کی عادت پڑ جائے گی اور تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ غالب دہلوی نے آپ ہی کے لیے کہا تھا۔ ع:

مشکلیں اتنی پڑیں ''تجھ'' پر کہ آساں ہو گئیں

زیادہ بھیڑ نہ ہو تو سوار ہوتے وقت بس کے پچھلے دروازے میں لگا ہوا بائیں ہاتھ

والا ڈنڈا اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیجئے۔ چلتی بس میں چڑھتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھیے، ورنہ ہاتھ سے محروم ہو جائیں گے۔ ایک بات کا اور دھیان رہے کہ بس کا نمبر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا مستحسن ہے۔

نمبر۳: ٹکٹ خریدنے کا فن

آپ بس میں سوار ہو گئے تو ٹکٹ خریدنے کا جہاد آپ پر فرض ہو جاتا ہے۔ ٹکٹ لے لیا تو غازی، ورنہ ٹکٹ چیکر آپ کو شہید کر دے گا۔ بس کے اندر ایک جان ہزار قالب ہو جانے کے بعد ٹکٹ کے لیے جیب سے پیسے نکالنے سے قبل مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا آپ کے حق میں مفید رہے گا۔

(الف) ہاتھ کو نہایت احتیاط کے ساتھ جیب کی طرف لے جائیں۔

(ب) اپنی ہی جیب میں ہاتھ ڈالیں۔

(ج) ریزگاری یا چھوٹا نوٹ نکالنے کی کوشش کریں۔ (اگرچہ اب تو ہر نوٹ چھوٹا سا ہو گیا ہے پھر بھی نسبتاً چھوٹا)

(د) رقم پتلون کی بیک پاکٹ میں ہو تو گھڑی والا ہاتھ پیچھے نہ لے جائیں۔

(ہ) ٹکٹ خریدتے وقت پیسوں والا ہاتھ کنڈکٹر کے منہ کے قریب لے جا کر ایک ٹکٹ فلاں مقام کا، ایک ٹکٹ فلاں مقام کا، والی گردان دہراتے رہیں، تا آنکہ ٹکٹ آپ کے ہاتھ میں آجائے۔ کچھ پیسے واپس لینے ہوں تو ٹکٹ لینے کے بعد بھی اپنا ہاتھ کنڈکٹر کے منہ کے قریب ہی رکھیں۔

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

نمبر۴: بس کے اندر کھڑے ہونے کا فن

سٹی بس کے اندر ڈرائیور کی سمت اپنا منھ اور کنڈکٹر کی جانب پشت کر کے ہرگز ہرگز نہ کھڑے ہوں، ورنہ کسی کو منھ دکھانے کے لائق نہ رہ سکیں گے۔ بس سے اترنے والے، دھکے اور صلواتیں، ایک ہی رفتار سے عطا کرتے ہیں۔ کھڑے ہونے کا بہتر اور آزمودہ طریقہ یہ ہے کہ اپنا منھ، سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی جانب اس طرح کر لیجیے کہ آپ کی اور دوسری جانب منھ کیے کھڑے مسافروں کی پشت کے درمیان ایک گلی سی تعمیر ہو جائے۔ کوشش کیجیے کہ کسی سیٹ کے ڈنڈے کے نزدیک کھڑے ہونے کی سعادت نصیب ہو، تاکہ بیٹھنے کے امکانات پیدا ہو سکیں۔ اگر ممکن ہو اور بیٹھا ہوا مسافر مرد ہو تو اس کے پیچھے اور آگے والی سیٹ کے دونوں ڈنڈوں کو پکڑ کر خمیدہ کمر والی پوزیشن میں اس طرح کھڑے ہو جایئے گویا بیٹھے ہوئے مسافر کی زندگی خطرے میں ہے اور آپ چوکنا ہو کر بطور کمانڈو، اس کی حفاظت پر مامور کر بستہ ہیں۔

نمبر۵: سیٹ پر بیٹھنے کا فن

اگر آپ کے قریب بیٹھا ہوا شخص اپنی حرکات و سکنات سے جگہ چھوڑ کر اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا ہو، تو بالکل اسی طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح مچھلی کے شکاری سار ہونے یعنی ڈور ہلنے پر ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ مچھلی کے شکار سے نابلد ہیں تو اس طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح لائن میں کھڑے ہوئے لوگ بس کو اسٹاپ کی طرف آتا ہوا دیکھ کر ہو جاتے ہیں۔ پھر اس سے پہلے کہ بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ

سے پورا اٹھے، اپنے آپ کو اس کی جگہ پر گرا دیں۔ پھر اطمینان سے اپنی دونوں ٹانگوں کو اتنا اوپر اٹھائیں کہ ٹانگیں آپ کے سر کے قریب پہنچ جائیں اور وہ شخص باہر نکل آئے۔ اس طرح اس کو باہر آنے کی جگہ دیتے ہوئے ٹانگوں کو نیچے گرا لیں، اب آپ سیٹ پر بیٹھ چکے ہیں۔

بیٹھنے کے عمل میں ذرا سی بھی غفلت یا مروت آپ کو ساری زندگی نہ بیٹھنے دے گی۔ دلی میں یوگا کی ٹریننگ کا ایک بڑا مقصد سٹی بس میں سیٹ حاصل کرنے کا فن سکھانا ہے۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد داد طلب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ چہرے پر انتہائی لاتعلقی کے آثار پیدا کر لیں بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ قریب بیٹھے ہوئے شخص سے خواہ مخواہ باتیں کرنے میں اس حد تک منہمک ہو جائیں کہ کسی جان پہچان والے کی آواز بھی گویا آپ کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض ناتجربہ کار، دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھ کر بیٹھے رہنے کی سعادت سے بہت جلد محروم ہو جاتے ہیں۔

نمبر۶: بس میں آگے بڑھنے کا فن

جب آپ بس کے اندر مجمع کو چیرتے ہوئے آگے کی جانب رواں دواں ہوں، تو اس بات کی بالکل فکر نہ کریں کہ آپ کا ہاتھ کس کے سر پر اور پاؤں کس کے پانو پر پڑ رہا ہے۔ ہر قسم کی چیخ پکار اور آہ و بکا کو ہنگامہ شادی اور احتجاج کو داد شعر سے تعبیر کریں، اس کے لیے آپ کا شاعر ہونا ضروری نہیں، شاعروں کی خصلت کافی ہے۔ گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے کی کوشش نہ کریں، نہ پیچھے پلٹ کر جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ آگے بڑھتے وقت چنگیز خانی خصائل اور کچلے

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

ہوؤں کے ردعمل پر صبر وتحمل کی عادت اکسیر بھی ہے اور مجرب بھی۔

نمبر ۷: بس سے اُترنے کا فن

یہ بڑا نازک فن ہے۔ تھوڑی سی بے احتیاطی یا کاہلی اندازے کی ذرا سی غلطی گھر سے بہت دور کر دیتی ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ شطرنج کے گھوڑے کی چال یاد رکھیے اور اپنی منزل سے ڈھائی اسٹاپ قبل' سیٹ چھوڑ دیجیے۔ پھر بتدریج آگے بڑھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کوشش میں آپ پر سات خون معاف ہیں۔ جیسا کہ آپ واقف ہو چکے ہیں' اترتے وقت بس کے انجن کی جانب زمین پر چھلانگ لگائیے اور اترنے میں پھرتی دکھائیے ورنہ یہاں پیچھے والوں کا تعاون آپ کے حق میں ہرگز مفید نہ ہوگا۔

یہ تھے وہ فنون جن کا سیکھ لینا آپ کے لیے فنون لطیفہ سے زیادہ مفید ہوگا۔ لیکن یہ فنون بھی اس وقت تک ناکافی ہیں جب تک آپ مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل پیرا نہ ہوں۔

ہدایات برائے مسافران دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن

(اول) یہ کہ سٹی بس میں سفر کرنے کے لیے کبھی اکیلے گھر سے نہ چلیں۔ کسی کو ساتھ رکھیں تاکہ (خدانخواستہ) اسپتال یا پولیس چوکی میں قیام کی اطلاع گھر والوں تک بروقت پہنچ جائے۔

(دوم) صاف کپڑے پہن کر نہ چلیں، اگر چلیں تو کپڑے آپ سے قیمتی نہ ہوں۔

(سوم) زیادہ رقم ساتھ لے کر نہ چلیں، البتہ بس کے کرایہ کے علاوہ اتنی فاضل رقم ضرور ساتھ رکھیں کہ ٹکٹ خریدنے سے چوک ہو جانے پر کام آ سکے۔

(چہارم) سامان اور خواتین کو ساتھ لے کر نہ چلیں۔ خاص کر ان خواتین اور اس سامان کو جو برقع میں یا آپ کو بہت عزیز ہو۔ (نوٹ: اس جملے میں لف ونشر مرتب یا غیر مرتب یا شاید دونوں موجود ہیں)۔

(پنجم) بچوں کو لے کر نہ چلیں۔

(ششم) بزرگوں کو لے کر نہ چلیں۔

(ہفتم) اپنوں کو لے کر نہ چلیں۔

(ہشتم) غیروں کو لے کر نہ چلیں۔

(نہم) یہ سوچ کر نہ چلیں کہ فلاں وقت فلاں جگہ اور فلاں وقت گھر پہنچ جائیں گے۔

(دہم) بس میں سیٹ پر بیٹھ کر چلنے کے ارادے سے کبھی نہ چلیں، ورنہ ارادوں کی شکست وریخت آپ کو مایوسی کے تاریک غار میں پھینک دے گی۔ بہتر ہے کہ بس میں کھڑے ہونے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلیں اس طرح ممکن ہے آپ کو زیادہ مایوسی نہ ہو۔ دلی کی سٹی بسوں میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کی طرح نصیب کا کام ہے۔ ورنہ عام طور پر لوگ لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(یازدہم) اگر آپ کو سٹی بسوں کے اسٹاپ پر آنے جانے کا وقت معلوم ہے تو اس معلومات پر گھمنڈ یا بھروسا ہرگز نہ کریں۔ دلی سٹی بسوں کا' بس اسٹاپ پر آنے جانے کا ٹائم تو ضرور ہوتا ہے مگر جس طرح ایڈیٹر کا مصنف کی

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں اسی طرح سٹی بس کا ٹائم ٹیبل سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

(دوازدہم) بس میں سوار ہو کر ڈرائیور' کنڈکٹر یا جیب کتروں سے آنا کانی کرنا دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنے کے مترادف ہے۔ ان تمام اصحاب کا احترام آپ پر اور آپ کے اہل وعیال پر لازم آتا ہے۔ اہل وعیال پر یاد آیا کہ اہل وعیال کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو بس کے سفر سے گریز کریں ورنہ باہم دگر عداوت' رقابت' اور غصہ کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔

آخر میں التماس ہے کہ غیرت' خودداری' مروّت' اور شرم وحیا کو سٹی بس کے سفر میں اپنے ہمراہ نہ رکھیں۔ ان کے بجائے بے حسی' بے مروّتی' تو تا چشمی اور سنگ دلی والے ہتھیار اس میدان میں آپ کے سچے رفیق ہوں گے۔

یاد رکھئے اگر آپ نے ان ہدایات پر عمل کیے بغیر دلّی کی سٹی بسوں میں سفر کرنے کی کوشش کی تو مستقبل کا مورخ آپ کا جغرافیہ بگاڑ سکتا ہے۔

○○

آخری اِفطار

ابھی ہم نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ ''کال بیل'' کی آواز نے اُلٹے پانو واپس لوٹنے کے محاورے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ حالانکہ اس وقت کسی کی بھی مداخلت ہمیں گوارا نہ تھی۔ یہ ہمارے مسجد جانے کا وقت تھا۔ رمضان المبارک کی برکت تھی کہ ہر قسم کے لہو ولعب سے ہم نے قریب قریب توبہ کر لی تھی' چنانچہ دن بھر میں دس پندرہ گالیوں کی جگہ دو چار ہی سے کام چلا لیتے۔ جھوٹ یا تو ''مصلحت آمیز'' ہوتا کہ اسے ''فتنہ انگیز'' راستی سے بہتر کہا گیا ہے یا پیشے سے وفاداری کے طور پر مجبوراً بولنا پڑتا۔ جھوٹ بولنا ہماری معاشی' معاشرتی' اور منصبی ضرورت اور ذمہ داری ہے اور ہم اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتنے کے قائل نہیں۔ چونکہ ہمارا ہر جھوٹ ''مصلحت آمیز'' اور ہر ''راستی فتنہ انگیز'' ہوتی ہے' اس لیے ہم اول الذکر کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ مگر دن بھر میں جھوٹی قسموں کی تعداد اب اتنی کم رہ گئی تھی کہ پوروں والی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ نماز کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ دکھا کر پڑھو' اس لیے جہاں دیکھنے والے زیادہ جمع ہو جاتے ہم ضرور پڑھتے۔ روزے کے مسائل میں ہم نے پڑھا تھا کہ اپنا منھ روزے داروں جیسا بنائے رکھو۔ بالکل ویسا ہی بنائے رکھتے۔ ایسا اچھا دین داری کا ماحول تھا کہ حوز غلماں کی مسکراتی ہوئی

اور رنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

آنکھیں ہمہ وقت ہمیں تکتی رہتی تھیں۔ ایسے پاکیزہ ماحول میں اور اس وقت ''کال بیل'' کی آواز، استغفر اللہ! بہرحال ''کال بیل'' کی آواز کا تیر کھا کر ہم جیسے ہی ''کمیں گاہ'' یعنی دروازے پر پہنچے تو وہی ہوا یعنی ''اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔''

ہمارے سر پر ٹوپی دیکھتے ہی ایک چیخا۔ ''کیوں میاں بڑی نمازیں چل رہی ہیں۔ خیر تو ہے! دوسرے نے گرہ لگائی۔ روزے بھی سبھی رکھنے کا ارادہ ہے کیا؟ ہم نے متکسرانہ انداز میں کچھ اس طور سے اقرار کیا جیسے ارتکاب گناہ میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اعتراف جرم کر رہے ہوں۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر ہم ابھی گھر آئے تھے اور اپنے ایک بزرگ دوست کی طرح رمضانی مسلمان بننے کی سعی کر رہے تھے۔ ان بزرگ کا دستور تھا کہ سحری کے وقت نہایت اہتمام کرتے' قورمہ' میٹھا چاول' نمکین چاول' دودھ' دہی' فیرنی' پھینیاں' مٹھائیاں' پھل اور نہ جانے کیا کیا نعمت ہائے مترقبہ اور غیر مترقبہ دسترخوان پر سجاتے۔ سحری میں آنکھ کھلنے کے لیے گھڑی میں الارم بھرنے کے علاوہ مختلف لوگوں کو ہدایتیں کرنا بھی نہ بھولتے۔ سحری کے وقت پابندی سے اٹھتے' جم کر سحری کرتے' مسواک کرتے اور پھر اطمینان سے چادر تان کر سو جاتے' رہا روزے رکھنے کا معاملہ تو یہ گھر کے دیگر افراد کی ذمے داری تھی۔ ایک روز ان کی اہلیہ نے پوچھا۔ کیوں جی! میں کہتی ہوں جب آپ روزہ رکھتے ہی نہیں تو اس قدر پابندی سے سحری پر اُٹھنے کی بھی کیا مار ہے؟ جھنجھلا کر بولے۔ واہ بھئی واہ! سحری بھی نہ کروں؟ کیا بالکل ہی کافر ہو جاؤں؟ تو قارئین بے تمکین! ''بالکل کافر'' ہونے کا ہمارا بھی ارادہ نہ تھا۔ بس ان کے اور ہمارے مذہبی جذبات میں اتنا سا فرق تھا کہ وہ سحری میں چوکنا رہتے اور ہم

افطار میں۔ ہم بہرحال فائدے میں تھے۔ ایک جانب تو اللہ میاں کی ہم سائیگی کے طفیل، مصارف طعام کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے۔ دوسری طرف اجتماعی افطار کے یقینی ثواب سے بہرہ مند۔ گویا ''ہمارے دونوں ہی میٹھے'' تھے۔ افطار میں عجلت کا حکم ہے۔ افطار سے قبل سائرن کا صبر آزما انتظار ہمیں شاق گزرتا تھا۔ یوں بھی ہم انتظار کے بالکل عادی نہ تھے، وہ اس لیے کہ معشوقان مجاز سے انتظار کرانے کی توقع تھی کہ یہ روایت انھیں کی قائم کردہ ہے' سو اس ''ماڈرن ایج'' میں انھوں نے بھی لذت انتظار سے محروم رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے، بلکہ آج کے معشوق وقت سے پہلے جائے ملاقات پر پہنچ کر عاشق کا انتظار کرنے لگے ہیں۔

خیر یہ تو عبارت معترضہ یعنی لکھتے لکھتے بہک جانے یا بھٹک جانے کی ایک مثال تھی، ورنہ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ رمضان میں ہمارا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر گھر آتے' پھر فوراً یعنی عصر و مغرب کے درمیان' (عصر کے قریب مغرب سے دور) پڑوس کی مسجد میں جا پہنچتے۔ خوش بختی سے ہمارا دولت کدہ (معاف کیجیے دولت کدہ ہم از راہ تکبر نہیں مصلحتاً کہتے ہیں۔ دراصل ہم کرائے کے مکان میں رہنے کے شوقین ہیں اور دوسرے کے مکان کو ''غریب خانہ'' کہنے میں تامل ہوتا ہے) ایک ایسے محلے میں واقع ہے جہاں کے مسلمان بڑے خدا ترس' عبادت گزار' وسیع القلب اور افطار شناس ہیں' انھیں اعلیٰ ذات کی صفات کی وجہ سے ہمارے پڑوس کی مساجد کے دسترخوان کھانے پینے کے برتنوں کی افراط و تفریط کا ایسا منظر پیش کرتے ہیں کہ یزید و بایزید دونوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اشیائے خورونوش کی اس فراوانی کا مشاہدہ ہمیں اس ولایتی کیمرے کی بدولت ہوا جو ایک دوست لے کر آئے تھے۔ افطار و نماز کے موقع پر مسلمانوں کی تصاویر کھینچنے کا شوق

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

انھیں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ایک مسجد میں اشیائے مذکورہ کی فراوانی نے ہمیں بے چین کر دیا، ورنہ ہم تو اپنے گھر میں چین سے تھے، جیسا کہ ہم نے خود کہا ہے

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

اس تقریب سعید کے موقع پر جب ہم پہلی مرتبہ مسجد پہنچے تو عجیب و غریب اور نا قابل یقین سا منظر سامنے تھا۔اب اسے آپ ہمارا حلفیہ بیان سمجھ لیں تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایک ہی دستر خوان پر کھانے پینے کی اتنی ورائٹیز کو یوں دست و گریباں اور گتھم گتھا ہوتے ہوئے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' ہماری (چہرے سے زیادہ شکم کی) آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔دستر خوان پر انواع واقسام کا ایک جم غفیر تھا اور تمام روزے دار حواس خمسہ کو دستر خوان اور سائرن کی جانب مبذول کیے ہوئے ہمہ تن صبر و استقلال کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف تھے۔معلوم ہوتا تھا کسی بہادر فوج کے دلاور سپاہی غنیم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے سپہ سالار کے اشارے کے منتظر ہوں۔

کثرتِ سامانِ افطار نے ہمارے جوشِ ایمانی کو اتنی زور سے للکارا کہ ہم نے بھی اس جہاد میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔اس پروگرام کا وہ سین جب سائرن کی آواز پر مقابلہ شروع ہوا، نا قابلِ فراموش تھا' اگر دستر خوان کو ایک نہر تصور کر لیا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نہر سوئز کی جنگ کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔بعض آزمودہ کار ہاتھوں کی مہارت دیکھ کر ہمارے منہ سے داد (مع افطاری) نکل جاتی۔

مثلاً سامنے سے ذرا بائیں ہٹ کر تازہ انار کے سرخ سرخ رسیلے دانے

دستر خوان پر بکھرے پڑے ہیں۔ان دانوں سے قدرے فاصلے پر چند انگوروں کا ایک خوشہ بھی نہ جانے کیسے ابھی تک باقی رہ گیا ہے۔معاً کچھ نگاہیں اس پر پڑیں۔چوطرفہ حملے کے امکانات پیدا ہوئے کہ اتنے میں یکا یک ایک مردِ ضعیف نے اپنے دائیں ہاتھ کا مال بائیں ہاتھ میں' بائیں ہاتھ کا منہ میں اور منہ کا سالم مال حلق سے اتارتے ہوئے مولانا آزاد کے مشہور چڑے، موسوم بہ ''قلندر'' کی یاد تازہ کر دی' اور اس صفائی اور بے باکی سے جھپٹا مارا کہ چشم زدن میں سارے انگور اُن کے قبضۂ قدرت میں تھے۔شاعر نے کہا ہے ''جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں خوشہ اسی کا ہے۔''

اب ایک اور مشاقی ملاحظہ فرمایئے۔دائیں جانب سے ایک گلگلہ لڑھکتا ہوا آکر سامنے سے نکل ہی جانا چاہتا تھا کہ ایک اسمارٹ جوان نے بائیں ہاتھ کو کیچ کی پوزیشن میں لاکر اسے نہایت آسانی سے اس طرح دبوچ لیا جیسے شہباز' مولے کو دبوچ لیتا ہوگا۔تب ہمیں معلوم ہوا کہ دستر خوان پر اقبالؔ کے کردار اور کرکٹ کے اسٹار بھی موجود ہیں۔

بہت دنوں کی بات ہے، ہم نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔نام تھا ''ون ملین ایئرس بی سی'' یعنی دس لاکھ سال قبل مسیح۔اس فلم میں ''قبل مسیح'' کی اس گونگی تہذیب کی عکاسی کی گئی تھی جسے تاریخ کی زبان میں پتھر کے زمانے کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ہماری غیر ناقص رائے میں پتھر کے زمانے والوں کا اپنا شکار کرنے اور کھانے کا انداز، پیشِ نظر انداز، سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگا۔اسی یکسانیت کی بدولت ہمیں اس نظریے یا نقطہ نظر کی معقولیت مشکوک نظر آتی ہے کہ پتھر کے زمانے والے ہمارے زمانے سے کم تہذیب یافتہ تھے۔خیر ہمارا موضوع تاریخ

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

نہیں' اس لیے اس گفتگو کو "جملہ معترضہ" قسم کی کوئی چیز سمجھ لیجیے مگر یہ نہ بھولیے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے' اس روز بھی دہرا رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے ہم نے بھی مسجد میں روزہ افطار کرنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور عہد کر لیا کہ سحری خواہ کہیں بھی ہو' افطار یہیں کریں گے۔ (افتتاحی تقریب میں یعنی پہلے روز داخلہ فیس کے طور پر افطاری کی ایک چھوٹی سی پڑیا ہم بھی اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولے تھے)۔ ہم نے ایک دو روز ہی میں عید کی نماز والی تنگیوں سے مسجد کے افطار والے ماحول کا بڑی گہرائی اور دور اندیشی سے مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ دستر خوان کے کس حصے میں کون سی شے کس طرح اور کب اُتاری جاتی ہے۔ چاند میاں ٹھیکیدار کے گھر کی افطاری کس وقت آتی ہے اور حاجی الٰہی بخش صاحب مدظلہ کیا بھیجتے ہیں، اور یہ کہ ہمیں کچے گوشت کے کباب حاصل کرنا ہیں تو کہاں بیٹھنا چاہیے، اور فروٹ چاٹ اور دہی بڑا مع میٹھی چٹنی بھیجنے والے صاحب ثروت اصحاب خیر مسجد کے کس دروازے سے ملحق ہیں اور یہ بھی کہ کن کن گھروں کی خواتین کون کون سی ڈشیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ (ید طولیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ ہمیں اس کے تلفظ پر اعتماد نہیں اس لیے ہم اسے صرف تحریر ہی میں استعمال کرتے ہیں)۔

یہ دوسرا جملہ معترضہ تھا ممکن ہے آگے ایک آدھ اور بھی جملہ معترضہ ہو مگر ہمیں فی الوقت اتنا یاد ہے کہ ہم آپ کو دستر خوان پر پوزیشن سنبھالنے کے آداب یا گُر سمجھا رہے تھے اور یہ بتانے والے تھے کہ ہم دستر خوان کے کسی ایک کنارے پر بیٹھ کر افطاری اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کھسکانے کے فن سے بھی بڑی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر ہم دستر خوان کے کسی ایسے مقام پر بیٹھنے کے

لیے مجبور ہیں جہاں خزاں ہی خزاں ہے اور اطراف و جوانب میں بہار آئی ہوئی ہے، یعنی ہمارے آگے اُبلے ہوئے چنے' تلے ہوئے پاپڑ' پکوڑیاں (وغیرہ) قسم کا پیٹ بھراؤ مال ہے اور مٹھائیاں یا پھلوں کے قبیل کی اشیائے خوردنی غیروں کے سامنے اور ہم سے فاصلے پر ہیں تو ہم قدرے فیاضانہ بلند آواز میں "یہاں بہت ہے' اِدھر سے لیجیے" کہتے ہوئے چنے پکوڑیاں وغیرہ اِدھر اُدھر سرکائیں گے اور انھیں دھکا دیتے ہوئے دور تک اس طرح لے جائیں کہ ہمارے سامنے نہ رہنے کے برابر رہے پھر گویا منصفانہ انداز میں حساب برابر کرتے ہوئے جب ہمارا ہاتھ دستر خوان پر گھستا ہوا واپس آئے گا تو دستر خوان کا نقشہ ہی دوسرا ہوگا۔ دیکھا آپ نے ہاتھ کی ایک ذرا سی صفائی کے نتیجے میں ہم خدا کی کتنی متر قبہ اور غیر متر قبہ نعمتوں سے محروم رہنے سے بحمداللہ صاف بچ گئے' مگر یاد رہے کہ یہ تمام گُر صرف اُن دستر خوانوں کے لیے ہیں جن میں کھانے کی ساری اشیا آپس میں گڈمڈ ہو کر اتحاد باہمی کا وہ قابلِ رشک نمونہ پیش کرتی ہیں کہ محمود و ایاز میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈونگوں' ڈشوں اور پلیٹوں والے دستر خوان کے آداب ان سے مختلف ہیں' اگرچہ وہاں بھی نفسی نفسی کا یہی عالم ہے۔

وہاں کی صورت حال کو واضح طور پر دو زُمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک زمرے میں رکابی دار (رکابدار نہیں) یعنی خود پلیٹ والا اپنی پلیٹ ہاتھ میں لے کر ڈونگے یا ڈش کے پاس بہ نفس نفیس جاتا ہے' اسے "کھڑا کھانا" کہنا چاہیے۔ مگر بوفے سسٹم کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرے زُمرے میں ڈونگے' ہاتھوں ہاتھ پلیٹ والے کے پاس پہنچتے ہیں اور میاں ذرا وہ ڈونگا بڑھانا' یہ پلیٹ اٹھایئے۔ بھائی ذرا اِدھر دیجیے! قسم کی آوازوں کے بیچ تمام ڈونگے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

سے ادھر تھرکتے اور مسلسل گردش کرتے ہوئے مستقل ہوا میں معلق رہتے ہیں' تا آنکہ ان کا مال ختم نہ ہو جائے۔ ڈونگوں کو معلق رکھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پلیٹ والا' اپنے دائیں ہاتھ سے پلیٹ اور منہ کے درمیان نوالوں کا تسلسل قائم رکھتا ہے اور بائیں ہاتھ سے اپنا ڈونگا کسی اور کے بائیں ہاتھ میں تھما کر' کسی اور کے بائیں ہاتھ کا ڈونگا پھر اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ اس عمل میں چوکنا رہنے کی بڑی ضرورت ہے' مبادا' جس مال کی ڈش آپ نے ابھی سپلائی کی ہے' کوئی شخص اسی مال کی ڈش آپ کو دوبارہ نہ تھما دے۔

پہلی قسم یعنی کھڑے کھانے کے آداب الگ ہیں۔ اس میں پلیٹ والا' اپنے مقدر کا سارا کھانا ایک ہی وقت میں اپنی پلیٹ میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو ہاتھ کی خالی پلیٹ ڈونگے کی جگہ رکھ کر بھرا ہوا ڈونگا اٹھا لے' لیکن بوجوہ اس خواہش کی تکمیل نہیں ہو پاتی' اس لیے ڈونگے کو پلیٹ سے تبدیل کرنے کی بجائے ڈونگے کا سارا مال اپنی پلیٹ میں منتقل کر لیا جاتا ہے۔ اس کارروائی کے دوران باقی پلیٹوں والے صبر کھاتے اور غصہ پیتے ہیں۔ پھر جب کوئی نئی ڈش آتی ہے تو اجمیر والے خواجہ صاحب کی دیگ کے لگنے کا منظر پیش کرتی ہے۔ کھڑے کھانے میں قسمت والے ہی پیٹ بھر کر گھر آتے ہیں۔ سنا ہے انگریزوں نے شام کی چائے کے ساتھ پلیٹ میں ڈرائی فروٹس یعنی سوکھے میوے رکھ کر لان میں ٹہلتے ہوئے اور دوسرے ٹہلنے والے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جس کھانے کو رواج دیا تھا' یار لوگوں نے اس رواج کو مرغ و بریانی کے حوالے کر دیا۔

ذرا تصور کیجیے کہ ایک بھاری بھرکم پلیٹ میں مرغ کی چار رانیں' چھ دہی

بڑے' ایک پاؤ چاول' مع بوٹیاں' چار سیخ کباب اور سو گرام سلاد، ایک ہاتھ میں اور دیزو گداز تندوری روٹی' دوسرے ہاتھ میں ہو تو بھلا آپ روٹی کس طرح توڑیں گے اور بوٹی کس طرح کھائیں گے۔ مگر ہم نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا' بلکہ ہم نے تو باہوش و حواس یہ تک دیکھا ہے کہ ایک ماہر فنکار نے جو بائیں ہاتھ میں پلیٹ نما ڈونگا تھامے کھڑا تھا، اپنے دائیں ہاتھ کی روٹی نہایت اطمینان سے بائیں بغل میں اس طرح داب رکھی تھی جس طرح مرزا رفیع سودا نے ''تضحیک روزگار'' میں اپنا گھوڑا بغل میں داب لیا تھا۔

اس کھانے کے اور بھی بہت سے ہنر ہیں مگر یہاں ان کے بیان کا موقع نہیں' یہاں تو ہم دسترخوان پر رکھ کر کھانے والی افطاری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ مندرجہ بالا جملے کو تیسرا ''جملہ معترضہ'' سمجھ لیجیے۔ وہی جملہ معترضہ جس کی ہم نے قبل از وقت پیشین گوئی کر دی تھی۔ پچھلی بات وہاں ختم ہوئی تھی کہ ہاتھ کی ایک صفائی کے نتیجے میں ہم خدا کی بہت سی نعمتوں سے محروم رہنے سے بحمداللہ صاف بچ گئے۔

اور اب نئی بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اس طرح ہم نے دسترخوان کی بساط کے اور بہت سے گر نسبتاً بہت جلد سیکھ لیے۔ دو چار کمزور قسم کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاص چوکیوں پر قبضہ جمانے کا گر آزمانے کے سلسلے میں ایک بار ہماری درگت بنتے بنتے رہ گئی۔ ہوا یوں کہ ایک خاص چوکی پر، جو وضو کرتے ہوئے ہماری نظر میں آئی تھی اور جو مسجد کے ''فیض رساں'' دروازے سے اس قدر ملحق تھی کہ محلے سے آنے والی افطاری کے سارے خوان سب سے پہلے اسی کو رسد فراہم کرتے تھے' ایک صاحب اپنے یتیم صورت بچے کو بٹھا کر وضو فرمانے چلے

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

گئے۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور قصر نماز کی طرح قصر وضو کرتے ہوئے بعجلت پہنچے اور بچے کو ایک جانب کھسکا کر اسی چوکی پر قبضہ جمالیا۔ موصوف جب واپس تشریف لائے تو انھوں نے وہاں ہماری نشست کو چیلنج سمجھا۔ نہایت غیر مہذب انداز میں بولے "اے مسٹر ذرا اٹھئے تو! ہم لہجے کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے پلٹے ہی تھے کہ ان کے ورزشی جسم پر نظر پڑ گئی اور ہماری شرافت عود کر آئی (جو ایسے موقعوں پر اکثر عود کر آتی ہے) ہم نے سوچا میاں چھوڑو بھی لڑائی بھڑائی سے کیا حاصل؟ پھر ہم ایک ایسے ملک کے باشندہ ہیں جہاں عدم تشدد پر بے شمار تقریریں ہو چکی ہیں۔ اور آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے اپنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم نے انھیں معاف کر دیا اور اسی وقت سے "امن پرائز" کا انتظار کر رہے ہیں' ہم نے یہی سوچا کہ مسجد میں بات بڑھنے سے مسجد کی بدنامی ہوگی۔ ہوسکتا ہے لوگ افطاری بھیجنا بھی بند کر دیں یا کم از کم افطاری میں تخفیف تو لازماً ہو جائے گی۔ مسجد سے باہر ہوتے تو ہم انھیں بتاتے کہ اب ہم اتنے بھی کمزور نہیں کہ اگر وہ دو چار ہاتھ جھاڑ دیں تو ہم دو چار گالیاں بھی نہ دے سکیں۔ وہ اگر طاقت کے زعم میں ہمارا منھ بند کر دیں گے تو ہم دل ہی دل میں دیں گے۔ مگر انھیں گالیاں ضرور دیں گے۔

مجھے اسیر کریں یا مری زباں کو بند کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

بظاہر ہم نے انھیں معاف کر دیا تھا اس لیے ان سے دور جا کر بیٹھ گئے۔ اس سے آپ ہماری دور اندیشی' سیر چشمی اور دریا دلی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس ایک "Not to be Quoted" واقعے کے علاوہ ہم آپ کو بتائیں کہ دروازے کے

ساحل سے دسترخوان کے سمندر تک افطاری کی کشتیاں درآمد کرنے کے وسیلے سے ہم اہلِ دسترخوان کی نظروں میں خاصی اہمیت اور عزت حاصل کر چکے تھے۔ دسترخوان کے لوگ ہمارا اسی طرح احترام کرتے جس طرح سائنس کے طلبا اپنے اساتذہ کا اور آرٹس کے اساتذہ اپنے طلبا کا احترام کرتے ہیں۔ مسجد سے باہر بھی دسترخوان کے غازی نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ہم سے ملاقات کرتے۔ پھر ہوتے ہوتے ہم اس دسترخوان کے سینئر ممبر ہو گئے اور بزرگوں کے اس قول پر کہ مسجد میں جانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے' ہمارا یقین پختہ تر ہو گیا۔ جس روز سے ہم نے مسجد میں جا کر افطار کرنے کا آغاز کیا تھا۔ دل کے ساتھ ہوٹل کا بل بھی ہلکا ہو گیا تھا۔

اس لیے "کال بیل" بجانے والے دوستوں نے جب ہمیں فلم کی دعوت دی تو ہم چراغ پا ہو گئے۔ آج تو ہم کسی بھی صورت میں اور کسی بھی تفریح میں دوستوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور وہ یوں کہ آج کا دن افطار کے نقطۂ نظر سے "مرغ مسلم" والا دن تھا۔ پچھلے تجربات و مشاہدات نے ہمیں افطارِ جمعہ کی عظمت کا قائل کر دیا تھا۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ مسلم خواتین خواہ گھر کے مردوں کو نماز کے لیے مسجد نہ بھیج سکیں مگر مسجد میں افطاری بھیجنے کے ثواب سے محروم رہنا ہرگز پسند نہیں کرتیں۔ پھر آج کے دن کی ایک اور اہمیت بھی تھی۔ آج کا جمعہ نہ صرف جمعۃ الوداع یعنی رمضان کا آخری جمعہ تھا بلکہ آخری روزہ بھی تھا۔

یہ تو وہ نادر موقع ہوتا ہے جب مساجد کے دسترخوان افطاری کے دریا بن جاتے ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے صاف لفظوں میں دوستوں سے کہہ دیا کہ ہم رمضان جیسے مبارک اور

اورنگ زیب فلمی

www.urduchannel.in

پاک مہینے میں فلم جیسی نامبارک اور ناپاک چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم انھیں بھی یہ مشورہ دینا چاہتے تھے کہ اس خیال بد سے باز رہیں۔ معاً خیال آیا کہ انھوں نے ہمارا مشورہ مان لیا اور خیال بد سے باز رہ کر اسی مسجد میں چلے آئے تو ہماری لیڈر شپ میں بادھا آجائے گی۔ اس لیے ہم نے یہ مشورہ بھی نہیں دیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو ہم بھی بن ٹھن کر ذرا جلد ہی مسجد میں جا پہنچے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھے نمازی' یا نماز کے نئے نئے شوقین جمعہ کی نماز کے لیے اذان سے پہلے مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بس یہی حال جمعہ کے افطار کا ہے۔ مسجدوں کے افطار کی تاریخ میں آج کا دن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر آپ نے بھی ہماری طرح کسی مسجد کے دسترخوان پر پابندی کے ساتھ روزے افطار کیے ہوں تو آپ کو آج کے افطار کی اہمیت' مسجد کے دسترخوان کی عظمت' اشیائے خورونوش کی برکت' بے روزہ، روزہ داروں کی کثرت اور صاحبان افطار کی نقل وحرکت کا نہ صرف اندازہ ہوگا بلکہ آپ خود بھی معترف ہوں گے۔ مختصراً آج ہم اپنی دانست میں جلد ہی مسجد پہنچ گئے اور اگلی صف (صف سے مراد دسترخوان کی اگلی صف ہے) جی ہاں! اس دسترخوان پر صفیں بھی ہوتی ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے کہ سب سے آگے والوں کی صف دسترخوان کے ''تقریباً'' اوپر ہوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بیٹھنے والوں کے پیروں کے انگوٹھے اشیائے افطار کو اور ایڑیاں فرش کو چھو رہی ہوں۔ خاص حالات یعنی ایمرجنسی میں اس سے بھی آگے' اشیائے خوردنی کے تقریباً اوپر۔ بڑی ایمرجنسی میں ''تقریباً'' کا رسمی پردہ بھی اسی طرح اتار دیا جاتا ہے جس طرح پردہ نشیں

لڑکیاں کالج پہنچ کر اپنا نقاب اتار دیتی ہیں۔

دسترخوان کی دوسری صف' پہلی صف سے متصل' اور اس قدر متصل کہ مسجد کے علاوہ کہیں اور متصل ہو جائے تو اگلی صف والے ''ازالہ حیثیت عرفی'' کا دعویٰ دائر کر بیٹھیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ دوسری صف والے اپنا رزق کیونکر حاصل کرتے ہوں گے۔ اس منظر کی منظر کشی آسان ہے بشرطیکہ آپ نے کسی مشہور تماشے کے موقع پر شائقین کو ٹکٹ خریدتے دیکھا ہو۔ نہیں دیکھا تو اب ضرور دیکھ لیجیے۔ آپ کی نالج میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ دسترخوان کی تیسری اور آخری صف کے لوگ' کھڑے کھڑے روزہ افطار کرتے ہیں۔ یہ حضرات اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے افراد کے سروں پر جھک کر دسترخوان تک پہنچتے ہیں اور منھی میں رزق لے کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں' پھر کھڑے ہی کھڑے ہاتھ میں دبا ہوا اپنا رزق پورا کرتے ہیں۔ ختم ہونے پر پھر جھک جاتے ہیں۔ اس عمل میں ان کے گھٹنے پچھلی صف والوں کی پشت پر' پیٹ ان کی گردن پر اور سینہ اگلی صف والوں کے سروں پر ہوتا ہے اور ہاتھ دسترخوان پر جھول جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن کے سروں پر یہ حضرات لٹکے ہوتے ہیں انھیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت بڑی دشواری پیدا ہو جاتی ہے جب وہ گردن سیدھی کرنے کی غرض سے اپنا سر اونچا کر لیتے ہیں' ایسا کرنے سے سروں پر جھکے ہوئے لوگوں کے پیر بھی زمین سے اوپر اٹھ جاتے ہیں اور وہ ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ ''شاذ'' خود بھی ''نادر'' ہے۔

ہاں تو قارئین خوش تمکین! میں عرض کر رہا تھا کہ کھڑی صف والوں کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے جھکنے' رزق حاصل کرنے اور سیدھے کھڑے ہو کر اسے پورا

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

کرنے کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک دستر خوان موجود رہے اور دستر خوان اس وقت تک موجود رہتا ہے..... چھوڑیے! خواہ مخواہ بات طویل ہوجائے گی اور اختصار میں خلل پڑے گا۔ اجمالاً یوں سمجھئے کہ کچھ لوگ مغرب کی اذان شروع ہونے کے بعد دستر خوان چھوڑتے ہیں اور کچھ نماز شروع ہونے کے بعد' کچھ اذان ختم ہونے کے بعد اور کچھ نماز ختم ہونے کے بعد (براہ کرم اس جملے میں جہاں جہاں لفظ' کچھ' آیا ہے، اس کے آگے بطور احتیاط ایک لفظ' تقریباً' اور چپکا لیں ورنہ بات حرف بہ حرف صحیح ہوجائے گی اور آپ کو معلوم ہے کہ ''راستی فتنہ انگیز'' ہو تو ''دروغ مصلحت آمیز'' سے بہتر نہیں)۔

آیئے، اب وہیں واپس چلتے ہیں جہاں ہم نے کہا تھا کہ ہم مسجد میں پہنچے۔ یہاں سے ہماری داستاں خوں چکاں کا باب کچھ یوں کھلتا ہے کہ جب ہم مسجد میں پہنچے تو وہ خیال صریحاً غلط ثابت ہوگیا جس کے بل پر ہم اگلی صف میں بیٹھنے کا خواب دیکھ رہے تھے' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قصے کو ایک ذرا سا بریک دے کر ہم آپ کو یہ قیمتی معلومات فراہم کردیں کہ آگے بیٹھنا کتنا بھی تکلیف دہ ہو، اس میں مالی نقصان کا اندیشہ کم سے کم رہتا ہے (نوٹ: مالی نقصان سے ہماری مراد مال المومنین یعنی دستر خوان کا مال ہے) صفوں اور چوکیوں کے حالات دیکھ کر ہم ابھی مایوس ہونے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک شناسا چہرے نے ڈھارس بندھائی اور ہم پُر امید ہوکر با اشتیاق ان شناسا تک پہنچ گئے، مگر جب ان تک پہنچے تو وہ توتا بن چکے تھے۔ ہمیں سخت صدمہ ہوا۔ دوستوں کی بے وفائی اور بے اعتنائی پر سیکڑوں اقوال زریں اور ان سے بھی زیادہ اشعار ذہن میں کلبلانے لگے، مگر ہمیں غالب کے اس شعر میں سکون نصیب ہوا جس میں غالب نے کمال

ذہانت کے ساتھ زمانے کے بڑے سے بڑے آزار کو خود آزاری میں مبتلا کردیا ہے۔ کہتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

ہمیں یاد آیا کہ پچھلے جمعہ کی ایمرجنسی میں ہم نے جن صاحب کو اپنی پشت والی صف میں جگہ دلوائی تھی، وہ آگے بیٹھے ہیں اور اب آج ان کی باری ہے مگر انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ خیر انھیں ہم اگلے رمضان میں دیکھ لیں گے، فی الحال تو کہیں جگہ تلاش کرنی چاہیے، یہ سوچ کر ہم ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگے مگر کہیں کسی صف میں داخل ہونے کا ایک سوراخ بھی نظر نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سارا کا سارا مجمع جڑواں پیدا ہوا ہے۔ ہم ابھی تلاش معاش کے ''بحر ناپیدا کنار'' میں غوطہ خوری ہی کر رہے تھے کہ سائرن کی آواز نے حواس باختہ کردیا۔ تمام ''غازیان افطار'' بیک وقت دستر خوان پر ٹوٹ پڑے۔ ہم بھی بے محابہ اور بے تحاشہ لپک کر اسی ''ہجوم مشتاقاں'' میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ دستر خوان کے نزدیک ایک بزرگ، بے ضرر معلوم ہوئے۔ چنانچہ انھیں کے قریب کھڑے ہوکر دستر خوان پر جھکنے کی جسارت کر بیٹھے۔ قریب تھا کہ ہمارا ہاتھ دستر خوان کی اشیائے خورونوش کے ذائقے دار لمس سے لذت یاب ہوجاتا مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔'' اس فرشتہ صورت بزرگ نے اس زور سے ہمیں دھکا دیا کہ ہم ایک دوسرے بزرگ پر جا پڑے۔

اس کے بعد ہماری دست درازی تو دھری کی دھری رہ گئی مگر وہاں ان دونوں بزرگوں نے زبان درازی شروع کردی اور ایسی زبان درازی کی کہ خدا کی

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

پناہ! کچھ باتیں تو چنوں کے ساتھ "نقطے ہٹا کر" بھی ان کے منہ سے نکل گئیں۔ ہمارے پیچھے کچھ نوجوان تھے جنھیں ابھی تک جگہ نہیں ملی تھی۔ انھوں نے اس پچویشن سے اس طرح بھرپور فائدہ اٹھایا کہ بزرگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ہمیں تو صف سے باہر کردیا اور خود پوزیشن سنبھال لی۔ دونوں بزرگوں نے ان کے کارنامے سے متاثر ہوکر انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور مال غنیمت سے ان کی بھرپور تواضع کرتے رہے۔ ادھر ہمارا یہ حال تھا کہ غصہ، ندامت اور افسوس کی شدت نے ذہنی توازن کے ساتھ ہمارا جسمانی توازن بھی بگاڑ دیا تھا۔ یہ حال زار دیکھ کر ہماری ہی جیسی مصیبت کے مارے دو چار اللہ کے بندے خدا انھیں جنت میں خوب افطاری کھلائے، نزدیک آئے اور ہمیں دلاسا دینے لگے۔ سچ ہے مصیبت میں مصیبت والا ہی کام آتا ہے۔ مصیبت والا مصیبت والا بھائی بھائی۔ ہم سب مل کر پانی کے مٹکوں تک پہنچے اور پانی سے روزہ کھولنے کی سنت ادا کرکے زیادہ ثواب حاصل کیا۔ اُدھر وہ سب غازیان دسترخوان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر انواع و اقسام سے بھرے پُرے دسترخوان پر طالع آزمائی کررہے تھے اور اِدھر ہم سوچ رہے تھے کہ وہ لوگ نہ معلوم کون سی فلم دیکھنے گئے ہوں گے!

○○

جب اچانک میکے سے.....

"آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ۔" کسی بیاہتا شاعر کا یہ مصرع سن کر ہمیں بھی اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آگیا۔ یادش بخیر! کیا اچھے دن تھے۔ ہم سیکڑوں نگاہوں کا مرکز تھے، ہر وقت کچھ حسینوں اور کچھ ان کے والدین کی نظریں ہمارے تعاقب میں رہتیں۔ گھر گھر آؤ بھگت ہوتی۔ پیار محبت کے ڈونگرے برستے اور ہماری تعریف و توصیف میں وہ ساری باتیں کہی جاتیں جو ہمارے اندر نہ پہلے کبھی تھیں اور نہ آج ہیں۔ پھر کچھ ایسا وقت پڑا کہ اس چرخ کج رفتار کو ہماری یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور ہمیں بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں ایک عدد بیوی کا شوہر بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ (حالانکہ ایک عدد بیوی کا شوہر بننے سے بزرگوں کی تقلید کا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا") یوں تو ہم اتنے نالائق کبھی نہیں رہے کہ بزرگوں کی برابری کا خیال بھی اپنے دل میں لاتے مگر ایک تو خود انھیں کا اصرار، دوسرے ہم نے یہ بھی سوچا کہ بھلا ایک دو شادیوں سے بھی کسی نے بزرگوں کی برابری کی ہے، جو ہم کریں گے۔ یہ خیال آتے ہی ہم اپنی شادی خانہ آبادی پر راضی ہوگئے۔

شادی سے قبل زندہ دلوں کے تمام شوق ہمارے اندر موجود تھے، شادی کے

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

بعد بھی موجود رہتے مگر ہماری بیوی ہمارے اعمال وافعال سے زیادہ خوش نہ تھیں، البتہ ہماری کچھ عادتوں سے بڑی مسرور ومطمئن رہا کرتی تھیں' مثلاً گھر کے اندر ہوتے ہوئے دوستوں کی آواز سن کر کہہ دینا کہ گھر میں نہیں ہیں' یا ان کے سسرالی مہمانوں کی ہر زاویے سے حوصلہ شکنی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے کھیلنے کودنے پر بھی انھیں کوئی اعتراض نہ تھا' بس ایک شرط تھی کہ دنیا بھر کے تمام کھیلوں میں ہماری پارٹنری کا حق صرف انھیں کو حاصل ہوگا۔

ہماری چند عادتیں تو انھیں بہت زیادہ عزیز تھیں۔ مثلاً کھانا پکانے' برتن صاف کرنے اور کپڑے دھونے کے ہمارے شوق کو وہ بہت سراہتیں اور اپنی سہیلیوں کے درمیان ہماری خصوصیات کا بیان کچھ ایسے فخریہ انداز میں کرتیں کہ ان کی سہیلیاں احساس کمتری کا شکار ہوکر کچھ حسد اور کچھ رشک کرنے لگتیں۔ بعض سہیلیوں نے ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے بھی دیکھا۔ ہم اپنی بیوی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ریشہ خطمی ہو جاتے اور جوش محبت میں کبھی کبھی ان کے کپڑے بھی دھو ڈالتے۔ ہمارے گھر میں یہ ''کبھی کبھی'' روز کا معمول تھا۔

بس ہماری بیوی کو اگر ہمارے کسی ذوق سے چڑ تھی تو وہ شعر شاعری کا ذوق تھا۔ وہ اسے شوق فضول کہا کرتی تھیں۔ بہت بیزاری تھی انھیں ہمارے اس ذوق سے۔ اس لیے ہمیں چوری چھپے یا ان کی غیر موجودگی میں اس ذوق فروزاں کی پرورش کرنی پڑتی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ماحول تھا۔ بیوی کو میکے گئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق میکے لے جانے والے جیب خرچ کو ابھی بیوی نے واپس آنے کی حد تک ختم نہیں کیا ہوگا' اس خیال کی شدت اور کچھ نئی غزلوں کی ترغیب تھی کہ آج ہم نے اپنے حوصلے کے بھرپور

تعاون سے اپنے ہی گھر میں ایک شعری نشست کا اہتمام کرلیا تھا۔ چند احباب شام ہی سے ہمارے دولت کدے پر جمع تھے (دولت کدہ ہم نے ازراہ مصلحت کہا ہے کہ دوسرے کے مکان کو غریب خانہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی) ''خیال خاطر احباب'' کے ساتھ ساتھ خیال داد شعر بھی تھا، اس لیے احباب کے آبگینوں کو ٹھیس سے بچانے کی خاطر مدارات پر یوں کمربستہ ہوئے کہ گھر کے بجٹ کے تمام آبگینے چکنا چور کر بیٹھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نشست شروع ہوئی جو بہت جلد شباب پر آگئی۔ بیاض میں انگلی دبائے ہم اپنی باری کے منتظر ہی تھے کہ ہمارے نام کا اعلان ہوا۔ ادھر یہ اعلان ہوا' اُدھر ''کال بیل'' نے کسی کی آمد کا اعلان کردیا۔ صاحب خانہ ہونے کی وجہ سے صدر مجلس سے اجازت حاصل کرکے ہم بہ نفس نفیس دروازے پر پہنچے اور کسی کی اس بے وقت آمد پر جھنجھلاہٹ کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور آنے والے پر نظر پڑی' شاعری کی ڈائری ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور ہم پہلے ہکا بکا ہوئے پھر حواس باختہ ہوگئے۔ دروازے پر ہماری بیوی کھڑی تھیں' جی ہاں بالکل وہی۔ ہم اپنے ہوش ٹھکانے کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہی تھے کہ بیوی کی آواز گویا دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ''اجی کیا میرا گھر آنا آپ کو ناگوار ہوا، یا نصیب دشمناں کچھ طبیعت ناساز ہے۔'' بیوی کے اس یکا یک نزول پر ہم سچ مچ سٹپٹا گئے تھے۔ چنانچہ خوش مزاجی کی ایکٹنگ کرنے کی کوشش میں ہم نے بدقت تمام کچھ کہنا چاہا تو ہکلانے لگے۔

''آپ! بخدا آپ!! یعنی کہ بیوی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہمیں تو آپ کو

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

دیکھ کر یقین کیجیے ایسی مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتے۔ دراصل آپ خود سوچئے۔ دیکھیے نا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس وقت یکا یک' اچانک یعنی کہ یوں آجائیں گی۔ دراصل اس وقت آپ کا آنا معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے۔ کل ہی ہم نے آپ کو خواب میں یاد کیا تھا۔ سچ ہے خواب کو تعبیر سے راہ ہوتی ہے۔

ہماری ان اول فول باتوں پر بیوی شاید مسکرانا چاہتی تھیں کہ معاً شاعری کی ڈائری پر ان کی نظر پڑ گئی' بس پھر کیا تھا۔ اچانک موڈ بدل گیا۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر آنے سے پہلے دم توڑ گئی۔ ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ زہر خندہ ہو کر بولیں۔

"اچھا تو یوں کہیے کہ شاعری فرمائی جا رہی ہے۔ جب ہی تو میں کہوں کہ آج یہ خوشامد کس لیے ہو رہی ہے۔ اس مختصر تمہید یا تشبیب کے بعد گریز سے گریز کرتے ہوئے براہ راست مدح پر آ گئیں۔" کیوں جی میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہوگا کہ اس آفت ماری کا پیچھا چھوڑو۔ مگر خدا جانے اس کمبخت میں ایسے کون سے لعل لگے ہوئے ہیں کہ جو دیکھو اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح واہ وا کر رہا ہے۔"

ہم بیوی سے واقف تھے کہ اب وہ کسی صورت بند نہیں ہو سکتیں' اس لیے جلدی سے ان کا ہولڈال اٹھایا اور مکان کے دوسرے حصے کی طرف چل دیئے۔ بیوی بھی بڑبڑاتی ہوئی ہمارے پیچھے چلی آئیں۔ غصہ ندامت اور خوف سے ہمارا خون' کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم ہو رہا تھا۔ ہولڈال رکھ کر خاموشی سے مشاعرہ گاہ میں پہنچے اور انتہائی غمزدہ چہرہ بنا کر بیوی کے آنے کی اطلاع دی اور ان کے ایک قریبی عزیز کے انتقال کی دکھ بھری خبر سنا کر سب سے معذرت کر لی۔ سب نے انگریزی طرز پر ہمارے غم میں شرکت کا اعلان کیا اور ہمارا کلام بلاغت نظام سنے

بغیر خوشی خوشی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے ایک اچٹتی سی نظر اپنے گھر پر ڈالی۔

عجیب منظر تھا۔ ہر چیز اپنے مقام سے محروم نظر آئی۔ یہاں آپ کو یہ بتانا از بس ضروری ہے کہ "ہماری بیوی" "شامت اعمال ما" انتہائی سلیقہ شعار واقع ہوئی ہیں۔ کیا مجال کہ ماچس بھی اپنا کام کرنے کے بعد اپنی جگہ پر واپس نہ آئے یا فرش پر تنکا نظر آ جائے۔ انتہا تو یہ ہے کہ پانی کے برتنوں کے ڈھکن ٹیڑھے ہوں یا کتابیں بکھرنا تو کجا آگے پیچھے بھی رکھی نظر آئیں تو انھیں اختلاج ہونے لگتا ہے' جب کہ ہمیں ایسا نہ ہونے پر یہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ خیر ہم تو شادی کے بعد ہی سے اختلاج کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر نہ ہو تو بیمار ہی نظر آنے لگتے ہیں مگر آج گھر کا حلیہ بیوی کا ہارٹ فیل کرنے کے لیے کافی تھا۔ باورچی خانے کے سارے جھوٹے برتن پانی کے مٹکوں کے پاس تھے۔ کتابیں تخت کے اوپر بکھری پڑی تھیں' بستر پلنگ کے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ سگریٹوں کے ٹکڑوں نے فرش کو داغدار کر دیا تھا۔ دروازے کی چلمن میں بنا ہوا روشن دان' یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگ کی چنگاری کا مرہون منت تھا یا سگریٹ کے کسی جلے ہوئے ٹکڑے کا۔ گھر کے سارے بستر، دوسرے کمرے میں مشاعرے کے لئے فرش بنے ہوئے تھے۔ لحافوں کو گول کر کے گاؤ تکیے بنائے گئے تھے۔ یہ درگت دیکھ کر ہم سہم گئے اور بیوی کو ہارٹ اٹیک سے بچانے کی فوری تدبیریں سوچنے لگے۔

سب سے پہلے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان اپنے مقام پر پہنچانے کی ناکام کوشش کی۔ ہمارا یہ عمل ایسا ہی اضطراری تھا جیسے کوئی چور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان باندھ کر لے جانا چاہتا ہو۔ چنانچہ ایسے

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

غیر فطری عمل کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ جو سامان اپنی جگہ برقرار تھا، وہ بھی بے قرار ہوگیا اور جو چیزیں اب تک کسی طرح محفوظ رہ گئی تھیں، وہ بھی خطرے میں پڑ گئیں۔

اس کارروائی سے فارغ ہوکر ہم بیوی کے پاس پہنچے اور ایک ماہر نسوانیات کے بتائے ہوئے نفسیاتی نسخے کے مطابق ان کے میکے کے حالات پوچھنے لگے۔ بیوی جو پہلے ہی سے منہ پھلائے بیٹھی تھیں، بھنا کر بولیں۔

''آپ کو کسی کے مزاج سے کیا سروکار ہے۔ آپ تو اپنی شاعری سے مطلب رکھئے!'' اور بس: اللہ اللہ خیر صلا۔

ہم نے کہا بیوی! آخر آپ کو شاعری جیسی عظیم چیز سے اتنا بیر کیوں ہے؟ جبکہ شاعروں نے تو بیوی کی اس قدر تعریف کی ہے کہ حور تک کہہ دیا ہے۔ آپ نے وہ گانا تو ضرور سنا ہوگا ''کیسی بھی بیوی ہو شوہر کے لیے حور ہے۔''

بیوی ابھی تک اندر کے حالات سے بے خبر تھیں، اس لیے ہماری باتوں میں آ گئیں اور موڈ میں آ کر بولیں۔

''اس گانے میں یہ کہاں ہے کہ شوہر کے لیے اپنی ہی بیوی حور ہے۔''

ہم نے کہا ''بیوی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اس کا پہلا مصرع بھی تو دیکھئے! صاف کہا ہے ع:

اپنی اپنی بیوی پہ سب کو غرور ہے

کہنے لگیں۔ ''شاعر کے دل میں چور ہے ورنہ ''اپنی اپنی'' کہنے کی کیا ضرورت تھی؟''

ہم بیوی کی اس دلیل پر جل کر رہ گئے مگر مصلحتاً خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ بیوی اٹھ کر گھر کے اس حصے کی طرف جانے لگیں جہاں سے ایک سیل بے اماں گزر چکا تھا، تو ہم نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''اب اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟ چھوڑیے صبح دیکھئے گا۔ اس وقت آرام کیجئے۔ تھک گئی ہوں گی۔''

ہماری اس خلاف معمول اور خلاف توقع ہمدردی نے جو بوکھلاہٹ میں ہم سے ہمیشہ ناوقت سرزد ہوتی ہے، بیوی کو کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ہم انھیں زیادہ سوچنے کا موقع دے کر اور زیادہ شکوک و شبہات میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے؟ اس لیے انتہائی پیار بھرے لہجے میں بولے۔

''آپ کو نہیں معلوم۔ آپ کی غیر موجودگی میں سارا گھر ہمیں کھانے کو دوڑتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، گھر کی رونق بیوی ہی کے دم سے ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ لفظ ''بیوی'' میں جو حروف آتے ہیں ان سے کتنے اچھے معنی نکلتے ہیں جیسے ''ب'' سے ''بیوٹی'' (سارے گھر کی) ''ی'' سے ''یاد'' (جو ہمیشہ بیوی سے وابستہ رہتی ہے) ''واؤ'' سے ''وسیلہ'' (ساری خوشیوں کا) دوسری ''ی'' سے دوسری مرتبہ ''یاد''۔

ہم نے کھینچ تان کر اچھے معنی تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بیوی بھلا کہاں چوکنے والی تھی۔ فوراً ٹوک کر بولیں۔ ''مگر عملاً تمام شوہر اپنی اپنی بیوی کو ''ب'' سے ''باندی'' ''ی'' سے ''یمدوت'' ''واؤ'' سے ''وبال'' اور دوسری ''ی'' سے ''یخنی'' سمجھتے ہیں۔''

ہم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا ''بیوی! آپ بہت زیادتی کر رہی ہیں۔ آپ نے شوہر اور شاعر دونوں کی توہین کی ہے۔ جب کہ دونوں رحمت ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

شاعروں نے عورت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔"

جھٹ سے بولیں "جی ہاں! غیر عورت کی تعریف میں۔ اپنی بیوی کی تو آج تک کسی نے تعریف نہیں کی۔"

ہم نے کہا "یہ سراسر تہمت ہے۔ الزام ہے۔ بہتان ہے۔ دور کیوں جاتی ہیں۔ لیجیے ہماری ہی غزل سنیے!"

کس قدر کیف بداماں ہیں ہماری بیوی
ایسی کیا ہوں گی کسی اور کی پیاری بیوی

اپنے میکے کی ہیں گر راج دلاری بیوی
تو ہیں سسرال کی بھی آنکھ کی تاری بیوی

بات بے بات پہ ناراض ہوئی جاتی ہیں
کیا ہی دلچسپ ہیں اللہ ہماری بیوی

ہم کو بھاتی ہے اسی وقت سے صورت ان کی
اپنے میکے میں تھیں جس وقت کنواری بیوی

سب عزیزوں نے بیک منگ کہا ہے ہم سے
خوب سیرت بھی ہیں واللہ تمھاری بیوی

اورنگ زیب قاسمی

کبھی خوش ہیں تو نظر آتی ہیں پوری شوہر
کبھی غصے میں وہ بن جاتی ہیں ساری بیوی

ہماری مرصع غزل سن کر بیوی مسکراتی ہوئی تیزی سے مڑیں اور گھر کے اسی حصے میں چلی گئیں جہاں مشاعرہ ہو چکا تھا۔ گویا "دل جس سے ڈر رہا تھا وہی بات ہو گئی۔" ہم بھی بڑبڑاکر ان کے پیچھے لپکے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بیوی گھر کا حلیہ دیکھ چکی تھیں اور ان کے دل و دماغ کے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بمبارٹمنٹ ہو چکا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہم بھی سوچ رہے تھے کہ:

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

اور ان کی یہ حالت تھی کہ:

کبھی وہ ہم کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتی تھیں

ساری فضا خاموش تھی مگر اس خاموشی میں اتنے دھماکے گونج رہے تھے کہ تصور کے کان بہرے ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ بیوی کا عالم یہ تھا کہ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور:

ہر سمت پڑھ رہی تھیں وہ اہل جفا کے نام

تھوڑے سے فاصلے پر:

ہم بھی کھڑے ہوئے تھے گنہگار کی طرح
پھر نہ جانے کیسے ناگہاں بیوی کی نگاہوں سے ہماری نگاہیں ٹکرا گئیں۔ ہمیں

www.urduchannel.in

ایسا لگا جیسے بیوی رونے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ ہم بوکھلا گئے اور بوکھلاہٹ میں بلا ارادہ اور بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا:

کیا نکھر آتی ہیں غصے میں ہماری بیوی

بیوی پر اس مصرعے کا کچھ ایسا طلسماتی اثر ہوا کہ روتے روتے اچانک ہنس پڑیں' اور آنسو جو رونے کے ارادے سے آنکھوں میں آ گئے تھے' ہنسی میں شامل ہو گئے۔ ہمیں ایسا معلوم ہوا جیسے پانی برستے برستے یکا یک دھوپ نکل آئی ہو۔

○○

"خالد محمود نے علم و ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ درس و تدریس کے ساتھ انہوں نے شاعری، تحقیق، تنقید، انشا پردازی اور طنز و مزاح وغیرہ میں اپنے جوہر دکھائے ہیں..... خالد محمود کے یہاں تجربات کی گرمی، احساس کی شدت، جذبے کی فراوانی اور فکر و نظر کی تازگی و توانائی نے کلاسیکیت کے رچاؤ میں رچ بس کر اور طنز کی ترشی میں تحلیل ہو کر اور زبان و بیان پر ان کی فن کارانہ گرفت میں ڈھل کر، ان کی شاعری کو صرف تازگی، نیا پن یا انفرادیت ہی عطا نہیں کی ہے بلکہ نئی نسل کے ممتاز شعراء میں ان کو ایک ایسی پہچان عطا کر دی ہے جو ان کی شخصیت کی طرح جانی پہچانی ہوتے ہوئے بھی جانی پہچانی نہیں لگتی۔"

پروفیسر آفاق حسین صدیقی

بہشت آنجا کہ.....

معزز سامعین اور قارئین! دنیا میں یوں تو سیکڑوں قسم کی آفات ارضی و سماوی موجود ہیں مثلاً آندھی آنا' اولے پڑنا' آپ جنگل میں ہوں تو شیر یا چیتے سے اچانک مڈبھیڑ ہو جانا وغیرہ۔ یہ بھی آفات ہیں مگر ان میں کوئی ایسی آفت نہیں جس کی پیش بندی یا تدارک ممکن نہ ہو۔ اس طرح کی ہر آفت کا پہلے سے علم' قیاس یا اندازہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو خبردار کر دیتا ہے۔ آندھی اور اولوں سے قبل ان کے آثار نظر آ جاتے ہیں' اس لیے آپ بھاگ کر کسی پناہ گاہ میں پہنچ سکتے ہیں۔ شیر اور دوسرے جنگلی جانور' اول تو خواہ مخواہ ستانا خود ہی پسند نہیں کرتے۔ پھر انسان جانتا ہے کہ ان سے ملاقات کب اور کہاں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مل بھی جائیں تو ان سے بچنے بچانے کی تدبیر کر لیتا ہے۔ بس بن بلایا مہمان ہی ایک ایسی بلائے ناگہانی ہے جس کے بارے میں کوئی پیش قیاسی ممکن نہیں۔

ذرا تصور کیجیے آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ ناشتہ تیار ہو چکا ہے۔ ضروری سامان باندھ کر رکھ دیا گیا ہے۔ بچے کپڑے بدلنے میں مصروف ہیں کہ اچانک کال بیل کی آواز آتی ہے' ٹرن' ٹرن۔ آپ کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر

اورنگ زیب فاسمی

www.urduchannel.in

جھانکتے ہیں اور پھر باہر کا منظر۔ آپ کے دور کے کوئی عزیز یا دوست یا دوست کے دوست یا وطن کے شناسا' اپنی ایک عدد بیوی اور چار عدد بچوں کے ساتھ مع ہولڈال موجود ہیں۔ اگر ایسا ہو تو کہیے آپ کیا کریں گے؟ ان کو ڈانٹیں گے' بھگائیں گے' دروازہ بند کرلیں گے' انھیں پہچاننے سے انکار کردیں گے' چیخیں گے' کپڑے پھاڑ لیں گے یا اپنا سر پیٹیں گے؟ کیا کریں گے؟ میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ جی ہاں ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ اس کے برخلاف آپ ان کو دیکھ کر مسکرائیں گے (یہ اور بات ہے کہ آپ کا دل رو رہا ہوگا)، ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کریں گے (حالانکہ یہ بالکل نقلی اظہار ہوگا) خیریت دریافت کریں گے (خواہ دل سے بددعا نکلتی ہو)، اور وہ سارا ناشتہ جو آپ کی بیگم نے ابھی تیار کیا تھا' ان کے آگے رکھ کر ناشتے اور پروگرام کی تباہی کا منظر دیکھیں گے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ پروگرام کے چوپٹ ہوجانے کا (بلند آواز میں) ماتم بھی نہیں کرسکیں گے۔ کسی نے جنت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہاں بن بلایا مہمان نہیں آئے گا ''بہشت آنجا کہ مہمانے نہ باشد''۔ میرا خیال ہے کہ ہماری دنیا اسی لیے جنت نہ بن سکی کہ اس میں بن بلائے مہمان ہی زیادہ آتے ہیں۔

خواتین وحضرات! آپ کسی بڑے سے بڑے نجومی سے مل لیجیے جو آپ کے ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہو یعنی آپ کب پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے اور کس دن داغ مفارقت دے بیٹھیں گے اور یہ بھی کہ پیدائش اور موت کے ان دونوں حادثات کے درمیان کتنی بیویاں اور کتنے بچے آپ کے نصیب میں ہوں گے۔ امیر بنے عرب جائیں گے یا یہیں کہیں بن جائیں گے۔ تعلیم ڈگری والی ہوگی یا علم والی' پیسہ اپنا ہوگا یا سسرال کا۔ مکان خود بنوائیں گے یا بنا بنایا پائیں گے۔ الغرض جو کچھ آپ معلوم کرنا چاہیں، وہ اور جو نہ معلوم کرنا

چاہیں گے، وہ بھی ممکن ہے کہ دست شناس آپ کو بتا دے، مگر ایک بن بلایا مہمان کس دن آپ کے گھر وارد ہوگا، آج تک کسی اختر شناس یا قیافہ شناس نے بتایا، اور نہ بتایا جا سکتا ہے، بس اتنا کہہ سکتا ہے کہ جب ستارے گردش میں ہوں گے تو یہ واقعہ ظہور پذیر ہوگا۔ مگر موت اور بن بلائے مہمان کی درآمد روکنے کی سبیل تا حال کوئی برآمد نہ کرسکا۔

مثال کے طور پر بچوں کو پولیو سے بچنے کے لیے ڈراپس یا مختلف بیماریوں سے بچانے کے لیے پیشگی انجکشن دے دیے جاتے ہیں۔ قحط اور سیلاب کے خوف سے اناج کا ذخیرہ اور مکان کا پشتہ تیار کرلیا جاتا ہے۔ جنگ کا خطرہ ہو تو دفاع کا بندوبست ہوجاتا ہے' ان تمام کاموں میں انسان کی کامیابی اس لیے ممکن ہوجاتی ہے کہ اسے ان سب چیزوں کا پہلے سے کچھ نہ کچھ اندازہ یا علم ہوتا ہے' لیکن چونکہ بن بلائے مہمان کی آمد کا کوئی وقت ہی مقرر و متعین نہیں، اس لیے کسی پیش بندی کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت تو پہلے سے علم ہوجانے کے بعد بھی کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کہیں گے کہ گھر سے ٹل جایئے۔ میری گزارش ہوگی کہ یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک ہمارے بزعم خود خیر خواہ' تشریف لائے اور انھوں نے اطلاع دی کہ فلاں صاحب مع اہل وعیال' دلی آنے والے ہیں' قیام آپ ہی کے گھر پر ہوگا۔ بس یہی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ہم نے ان کی اس خیر خواہی کا شکریہ ادا کیا اور حسب استطاعت تواضع بھی کی۔ اطلاع دینے کے معاوضے میں انھوں نے چار روز ہمارے ساتھ قیام فرمایا۔ دوران قیام اہل وعیال کے ساتھ تشریف لانے والے متوقع مہمان کی آمد سے پیش آنے والی دشواریوں کے خطرات سے ہمارے خیر خواہ صبح وشام ہمیں خوف

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

زوہ کرتے رہے۔ موصوف تاجر تھے اور اپنی دکان کا سامان خریدنے کی غرض سے حسب معمول دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمیشہ ہوٹل میں ٹھہرا کرتے تھے، مگر اس بار ہم پر جو رحم آیا تو ایک احسان کرنے سیدھے یہیں چلے آئے۔

سچ ہے خدا کی زمین نیک بندوں سے یکسر کبھی خالی نہیں ہوتی۔ خدا اپنے نیک بندوں کو پہلے امتحان میں ڈالتا ہے پھر ان کی مدد کرتا ہے۔ ہمارے خیر خواہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھیں جس دکان سے سامان خریدنا تھا وہ دکاندار بقول ان کے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس سے ان کا ادھار چلتا تھا' اس واسطے زیادہ رقم بھی ساتھ نہیں لائے تھے۔ اب ان کے نزدیک دو ہی راستے تھے' یا تو وہ دلی میں ٹھہر کر اس دکاندار کی واپسی کا انتظار کریں یا ہم ان کے لیے پیسے کا انتظام کر دیں تا کہ وہ دوسری جگہ سے سامان خریدنے کے لائق ہو جائیں۔ ہم شاید دوسرا راستہ اختیار کر لیتے مگر وہ ہماری استطاعت سے باہر تھا' مجبوراً بہ ہزار شرمندگی ہم نے معذرت کر لی۔ لیکن جب چار روز کے بعد بھی ان کا دکاندار واپس نہیں آیا تو قرض لے کر انھیں قرض دینا پڑا۔ جاتے جاتے اپنے تجارتی نقصانات اور چار دن خراب ہونے کی انھوں نے کچھ اس انداز میں شکایت کی کہ ہمیں ایک بار پھر شرمندہ ہونا پڑا۔ ان کا یہ کہنا شاید بجا تھا کہ جو قرض ہم آج لیا ہے، وہی اگر چار روز پہلے لے لیا ہوتا تو ان کا اتنا نقصان نہ ہوتا۔ بعد میں علم ہوا کہ ان کا دکاندار کہیں نہیں گیا تھا۔ دلی میں تھا مگر وہ پچھلا حساب بے باق کیے بغیر انھیں تازہ مال دینے پر راضی نہیں ہوا۔

بہر حال ان کے جانے کے بعد اہل وعیال والے مہمان کی آمد نے کچھ ایسا خوف طاری کیا کہ ہم بستر بوریا لپیٹ کر فوراً سسرال جا پہنچے' پھر اپنے حساب میں جب اہل وعیال والے مہمان کے آنے اور واپس چلے جانے کی تاریخ گزر گئی

تب گھر واپس لوٹے۔ گھر پہنچ کر نہایت اطمینان کے ساتھ ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھایا اور تکان اتارنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گئے۔ لیٹتے ہی نیند نے آدبوچا۔

خواب میں دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑے پنڈال میں سیکڑوں لوگ جمع ہیں۔ خوبصورت اسٹیج پر کچھ معزز ہستیاں براجمان ہیں۔ پنڈال کی اگلی صف میں چند کرسیاں سلیقے سے بچھی ہوئی ہیں' انھیں میں سے ایک کرسی پر ہم بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ تقسیم انعامات کا خصوصی جلسہ ہے۔ انعامات دو اصحاب کو دیے جائیں گے۔ ایک وہ سائنس داں جس نے کینسر کا کامیاب علاج دریافت کیا ہے اور ایک وہ سماجی کارکن جس نے بن بلائے مہمان سے محفوظ رہنے کا طریقہ معلوم کر کے شہر والوں پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہم نے سوچا پتہ نہیں یہ عظیم سماجی دانشور کون ہے، مگر اس دوسرے انعام کے لیے جب ہمارا نام پکارا گیا تو ہم حیران رہ گئے۔ سارا حال تالیوں سے گونج رہا تھا' چنانچہ ہم نہایت شان سے چلتے ہوئے اسٹیج پر پہنچے۔ صدر نشین نے ہمارے گلے میں ہار ڈال کر پہلے معانقہ اور پھر مصافحہ کیا۔ تمام لوگ تالیاں بجاتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے مگر صدر نشین نے مصافحہ اتنی زور سے کیا تھا کہ ہمیں اپنی انگلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ہم درد کی شدت سے بلبلا اٹھے اور پھر فوراً ہی ہماری آنکھ کھل گئی۔

اب دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے ایک بے تکلف دوست نہایت مضبوطی سے ہمارے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ ان کے بچے تالیاں پیٹ رہے ہیں اور دوست تمسخر آمیز لہجے میں کہہ رہے ہیں۔ اماں یار غضب کی نیند ہے تمھاری۔ کب سے اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں' مگر اٹھنا تو الگ رہا کروٹ بھی نہیں بدلی۔ اماں اس شور وغل میں تو مردے بھی جی اٹھتے ہیں۔ اٹھو! دیکھو کون آیا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ایک بچہ ہمارے سینے پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ہماری

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

گردن میں ہیں اور انکل انکل کہہ رہا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے میں جتنا وقت لگا ہوگا اس سے کہیں زیادہ سچویشن کو سمجھنے میں صرف ہوا۔ پھر جب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ وہی مہمان ہیں جن کے خوف سے ہم بھاگے بھاگے پھر رہے تھے تو جی چاہا کہ دھاڑیں مار کر رونا شروع کردیں، پھر قہقہے لگا کر خوب ہنسیں تاکہ لوگ ہماری صحیح ذہنی کیفیت سے واقف ہوجائیں۔ لیکن وائے افسوس ہم ایسا کچھ نہ کرسکے۔ بے جان سی نقلی ہنسی کے ساتھ انھیں خوش آمدید کہا اور معذرت کرتے ہوئے ان کے سفر کا احوال پوچھنے لگے۔

انھوں نے کہا 'یار تمھاری وجہ سے بہت پریشان ہونا پڑا۔ ہمیں جب یہ معلوم ہوا کہ تم کچھ روز کے لیے دلی سے باہر جانے والے ہو، تو اپنا پروگرام ملتوی کردیا۔ ریزرویشن کی تاریخ آگے بڑھوائی۔ اس نقصان کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ تم پر عائد ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ بچوں کی تعطیلات اور ملازمت کے جھمیلوں کی وجہ سے ایک ایک دن کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تمھاری نوکری تو ہے نہیں کہ کلاس میں گئے گئے، نہ گئے نہ گئے۔ بہرحال کل یہ سوچ کر چلے تھے کہ اگر تم اب بھی نہیں ملے تو آگے بڑھ جائیں گے اور پھر واپسی میں تمھارے ساتھ قیام کریں گے۔ بات یہ ہے کہ تمھارے بغیر بالکل مزا نہیں آتا۔ مبارک ہو! سنا ہے کہ تم نے گاڑی بھی خرید لی ہے۔ پھر مسکرانے لگے۔ مگر یار تم محض ٹیچر ہو، پھر یہ گاڑی واڑی کہاں سے مار دی۔ خیر کچھ بھی ہو میرے بچے بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں انکل کی گاڑی میں خوب گھومیں گے۔ ماشاءاللہ گاڑی ہے خوبصورت۔ بچے کبھی اس کی چھت پر لیٹتے ہیں' کبھی بونٹ پر۔ ذرا اٹھ کر دیکھو تو۔

ہم ان کے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کے لیے روتے ہوئے اٹھے، مگر اس طرح کہ ہمارے آنسو کسی کو نظر نہیں آئے۔ ہم نے مصنوعی اپنائیت کے انداز میں

کہا، یہ تم نے اچھا کیا کہ سیدھے یہیں چلے آئے۔ کہیں اور ٹھہرتے تو ہمیں شکایت ہوجاتی۔ مگر یہ تو کہو تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ ہم کہیں باہر جانے والے ہیں۔ جواب میں بولے، ارے یار اسی غریب نے بتایا تھا جو تم سے کچھ رقم قرض لے گیا ہے اور شاید ایک دو روز تمھارے ساتھ ٹھہرا بھی تھا۔ تمھاری بڑی تعریف کررہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تم نے ہوٹل سے اس کا سامان بہ اصرار اپنے گھر منگوالیا۔ مگر سنا ہے تمھارے یہاں مچھر اور کھٹمل بہت ہیں۔ اس غریب کا بُرا حال کردیا۔

قارئین وسامعین کرام (آپ جو بھی ہوں) کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ہمارا قصور صرف اتنا ہی تو ہے نا کہ ہم دلی میں رہتے ہیں' جہاں دنیا بھر کے سفارت خانوں کے ساتھ پاکستانی سفارتخانہ بھی ہے۔ پاکستان اور ہندستان کے خوشگوار سفارتی تعلقات' ان حکومتوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں یا غیر مفید' یہ تو سفارت کار یا سیاست داں ہی سمجھ سکتے ہیں مگر ہمارے حق میں اکثر غیر مفید ہوجاتے ہیں۔ جب دیکھو پاکستانی ویزا کے متوالے جوق در جوق دہلی میں موجود ہوتے ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ مع اہل وعیال اس انداز سے آتے ہیں جیسے ویزا آفیسر ویزا لیے ہوئے بس انھیں کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ پھر جتنے جانے والے ان سے زیادہ وداع کرنے والے۔ وداع کرنے والے اس خیال سے دہلی آجاتے ہیں کہ اس بہانے دہلی کی سیر بھی ہوجائے گی اور بچوں کی شاپنگ بھی۔ گویا آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ اب یہ عازمین پاک ہیں' ان کے لواحقین ہیں اور ہم ہیں۔ تینوں ایک' مگر کہانی جدا جدا۔

ہماری کہانی کا طریہ جسے آپ المیہ کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ بلا مبالغہ براہِ غریب خانہ بیسیوں ٹولیاں پاکستان گئی ہوں گی۔ جاتے ہوئے کوئی ہمارے ساتھ ایک دن رہا' کوئی ایک مہینہ اور کوئی اس سے بھی زیادہ۔ ہم نے حسب توفیق و

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

استطاعت ان کی پذیرائی بھی کی اور خاطر داری بھی، مگر جب ان کی واپسی ہوئی تو کسی نے دلی سے گزرنے کی اطلاع دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ سب کے سب خاموشی سے نکلے چلے گئے۔ ان کے گھر پہنچ جانے کے بعد کسی اور ذریعے سے یہ معلوم ہوجاتا کہ خدا رکھے فلاں صاحب' جو بعد از خرابی بسیار روانہ ہوئے تھے بہ ہزار عافیت (لدے پھندے) گھر پہنچ کر عزیزوں کو تحائف تقسیم کر رہے ہیں (حالانکہ اب پاکستان سے تحائف لانا اور تحائف لے جانا' گئے وقتوں کی باتیں ہیں)۔ اُن دنوں ہمیں ایک ارمان تھا کہ کوئی مسافر پاکستان سے واپسی پر بھی ہمارے گھر آنے کی تکلیف فرمائے۔ دیکھئے کب یہ ارمان پورا ہوتا ہے۔ شاید اب ہوجائے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے' مگر آج کا یہ بن بلایا مہمان ایسی عجیب وغریب مخلوق واقع ہوا ہے کہ اس کے بہت سے حقیقی واقعات بھی غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک مرتبہ وطن میں موسم سرما کی چھٹیاں گزارنے کے بعد جب ہم دلی واپس پہنچے تو اپنے ہی گھر کے سامنے ایک شناسا سے ملاقات ہوگئی۔ انھیں دیکھ کر تعجب ہوا۔ پوچھا آپ اس وقت یہاں کیسے؟ کیا آپ کو علم تھا کہ آج ہم آنے والے ہیں۔ ہنس کر فرمایا میں تو آٹھ روز سے یہیں آپ کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہم نے گھبرا کر مزید سوالات کیے تو معلوم ہوا کہ موصوف ایک انٹرویو میں دلی تشریف لائے تھے۔ انٹرویو کے بعد ہمارے گھر آئے۔ گھر میں تالا دیکھ کر مایوس ہوئے مگر ہار نہیں مانی۔ تالوں میں اپنی چابیاں آزمائیں تو ایک چابی سے تالا کھل گیا اور مایوسی جاتی رہی۔ تب سے یہیں مقیم ہیں۔ پڑوسیوں نے ان کی اس بے تکلفی اور اعتماد دیکھ کر یقین کرلیا کہ یہ ضرور کوئی قریبی عزیز ہیں جو ہم سے اجازت اور چابی لے کر آئے ہیں۔ انھیں

شکایت تھی کہ ہمارا مکان گراؤنڈ فلور پر نہیں ہے اور دھوپ بھی نہیں آتی۔

ایک اور ہم وطن اپنے سال بھر کے بچے اور بچے کی والدہ کے ساتھ تشریف لائے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ گھر کی تمام چیزوں پر عقابی نظر ڈالتے ہوئے بولے" فریج نظر نہیں آتا، ٹھیک ہونے گیا ہوگا۔" ہم نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ہمارے گھر میں فریج نہیں ہے۔ دونوں میاں بیوی تقریباً چیخ اٹھے۔" اوہ گاڈ!"۔ پھر ہماری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے ہم انسان نہیں کچھ اور ہیں۔ پھر کہا آپ گرمیوں میں کس طرح زندہ رہتے ہیں؟ ہمارا تو فریج کے بغیر ایک منٹ گزارا نہیں ہوسکتا۔ ہم نے بظاہر ندامت سے اپنا سر جھکالیا مگر دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اگر یہ فریج کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے تو بس اب دو چار منٹ کے ہی مہمان ہیں۔ اتنے میں ان کے بچے نے صوفے میں شوشو کرنا شروع کردیا۔ ہم نے گھبرا کر ان کی توجہ مبذول کرائی مگر وہ نہایت اطمینان سے بچے کی جانب دیکھ کر ہنستے ہوئے بولے۔ یہ شریر جب بھی صوفے یا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتا ہے، یہ حرکت ضرور کرتا ہے۔ دیکھئے ابھی نہ روکیے ورنہ مچل جائے گا۔

رات ہوئی تو ہمارے مہمان ناشتے سے لے کر لنچ اور ڈنر تک کا پورا مینو سمجھنے کے بعد ہمارے ہی بستر پر دراز ہوگئے' صبح چائے طلب کی' ہم نے رمضان کا ذکر کیا تو سفر کی رعایت کا مسئلہ بتا کر ہمیں یوں دیکھا گویا ہم مذہبی معاملات سے ناواقف محض ہیں۔ اس طرح تقریباً ایک ہفتہ ہمیں (فریج کے بغیر) شرف میزبانی عطا کرنے کے بعد بھی جب انھوں نے جانے کا نام نہیں لیا تو ہم نے جھجکتے ہوئے عرض کیا' عید پر ہم گھر جانے والے ہیں آپ کا کیا ارادہ ہے؟ فرمایا اب نکلے ہیں تو عید یہیں کرلیں گے' آپ چابی دے جائیں' جاتے وقت

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

پڑوسی کے حوالے کردیں گے۔ اتنے روز آپ کے گھر کی دیکھ بھال ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ اطمینان سے جائیں اور ہماری فکر بالکل نہ کریں۔ ہمیں یہ تکلیف ضرور ہوگی کہ بھابی کے ہاتھ کا لذیذ کھانا نہیں ملے گا مگر کچن میں سامان موجود ہے' ہم لوگ کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ اور ہاں آپ کو ایک زحمت یہ کرنی ہوگی کہ ہم نے کل جو اچیاں خریدی ہیں انھیں لیتے جائیے' ہمارے گھر پہنچا دیجئے گا۔ ایک اٹیچی میں کانچ کا سامان ہے' ذرا سی احتیاط کرنی ہوگی۔

عید کے بعد جب ہم گھر سے واپس آئے تو گھر میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے یا تو کسی غلط جگہ پر آگئے ہیں یا چوروں نے گھر کی تلاشی لی ہے۔ گھر کی کوئی شئے اپنی جگہ برقرار نہ تھی۔ بستر' پلنگ اور زمین پر مساوی تقسیم تھا اور اس پر جگہ جگہ مختلف ممالک کے پیشابی نقشے بنے ہوئے تھے۔ تمام برتن گندے تھے اور ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کتابوں کا غالباً بچے نے مطالعہ کیا تھا۔ القصہ مختصر قسمہا قسم کے مہمانوں کی میزبان نوازی کے بعد اب یہ حال ہوگیا ہے کہ:

ڈرتا ہوں ''کال بیل'' سے مہماں گزیدہ ہوں

OO

ایک ضروری وضاحت:

یہ مضمون صرف تفریحِ طبع کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں شامل واقعات کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں۔ کسی واقعے سے کسی مہمان کے اصلی واقعے کی مطابقت محض اتفاقی ہوگی۔ ماضی، حال اور مستقبل کے مہمانان کرام اس مضمون کو پڑھنے کی زحمت نہ کریں۔ پڑھ چکے ہوں تو اس کا اثر نہ لیں..... اور..... نہ اپنا ''ارادہ'' بدلیں۔ ''مہمان'' (خواہ بن بلایا ہی کیوں نہ ہو) میرے عقیدے کے مطابق خدا کی رحمت ہے۔

قلم برداشتہ

نوٹ: یہ رپورتاژ آج سے تقریباً ۲۶ برس پہلے اس وقت لکھا گیا تھا جب سیفیہ کالج بھوپال کا شعبہ اردو، تمام بھوپال کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور اس کی شہرت کی خوشبو تمام اردو دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔

عمر طبیعی کی راہ میں ہوش کے ناخن لینے کے بعد سے آج تک اثر' تاثیر' تاثر اور متاثر قسم کے الفاظ برابر سنتے آرہے تھے۔ مگر جب ان الفاظ کے معنی کی شدبد ہوئی اور ان کی بناوٹ اور استعمال کا طریقہ کسی قدر ذہن نشین ہوگیا اور لکھنے کے عمل سے گزرنے کا موقع ہاتھ آیا تو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ان الفاظ کا جا و بے جا استعمال کرنے لگے۔ اسی زمانہ سے ہماری زبان بغیر کسی جھجک کے اس قبیل کے جملے دہرانے لگی ''عمر کی بات میں بلا کی تاثیر تھی۔'' ''اس علاقے پر زید کا بڑا اثر ہے۔'' ''آپ کی تقریر سن کر سامعین بہت متاثر ہوئے۔'' ان کے لہجے کا تاثر دیر پا رہا۔ (وغیرہ وغیرہ) یہی وجہ تھی کہ جب استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کا حکم ہوا: خالد محمود ''اردوئے معلی'' کی اگلی نشست کے لیے آپ اپنے تاثرات لکھ کر لائیں گے، تو حسب معمول ہم نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ''جی'' کہا اور گھر پہنچ کر نہایت لاپروائی سے لحاف منہ پر کھینچ کر خراٹے لینے لگے

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

کہ یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

دراصل اردوئے معلیٰ کے اکثر پروگراموں میں ہماری حالت اس نیک دل مسلمان کی ہوجاتی ہے جو اگر لیٹا ہو تو اذان کی آواز سنتے ہی فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اکثر اوقات سر بھی ڈھانپ لیتا ہے اور اذان ختم ہوتے ہی اسی اطمینان سے پہلی والی پوزیشن میں آجاتا ہے جیسے اللہ میاں کا سارا قرض چکا دیا ہو۔ بہرحال ہم مطمئن تھے کہ قلم و قرطاس ہمارے پاس موجود بلکہ محفوظ ہیں۔ ایم۔اے (سال اوّل ہی سہی) کے طالب علم ہیں، اس لیے اردو ہماری اور ہم اردو کے ہیں۔ الفاظ کی کمی کا سوال، نہ خیالات کی کمی کی فکر، جب سوچ لیں گے قلم برداشتہ لکھ ڈالیں گے، چلو فرصت ہوئی، مگر جب ''قلم برداشتہ'' لکھنے بیٹھے تو اولاً ''بے یقینی'' ''ثانیاً'' ''حیرت'' اور ''ثالثاً'' ''جھنجھلاہٹ'' یکے بعد دیگرے تینوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

اب حالت یہ تھی کہ قلم ہاتھ میں اور کاغذ سامنے تھا۔ قلم میں روشنائی بھی لبالب بھری تھی۔ استادِ محترم کی ہدایت کے مطابق آدھے صفحے کا حاشیہ چھوڑ کر لکھنے کا ارادہ کیا تھا کہ اگر بعد میں کچھ یاد آگیا تو اضافہ کرنے میں آسانی ہوگی لیکن جناب گھنٹوں گزرنے کے بعد بھی کاغذ کا پورا صفحہ حاشیہ کی طرح سادہ کا سادہ ہی رہ گیا۔ اب تو ہمارا دماغ بھی حاشیہ بن گیا تھا۔ ہم نے سوچا کیا بات ہے؟ آخر ہم سے یہ تاثراتی مضمون کیوں نہیں چلتا۔ یہ تو بزعم خود ہمارے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ہم افسردہ سے ہوگئے۔ نہ جانے ہماری صلاحیتوں کو کیا ہوگیا ہے۔ خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سرے سے متاثر ہی نہ ہوں۔ یقیناً یہی بات ہے، جب موضوع ہی نہیں تو الفاظ، کاغذ اور قلم دوات کیا کریں گے۔ ہو نہ ہو ہم متاثر ہی نہیں ہو پائے ورنہ اس سے قبل آدھے ادھورے ہی سہی، کئی مضامین لکھ چکے ہیں۔ یہ سوچ کر دل

کو تقویت پہنچی کہ دراصل قصور ہمارا نہیں موضوع کا ہے جو ہمارے لیے عنقا ہوگیا ہے اور عنقا پر کچھ لکھنا بقولِ خود، خوش مذاقی ہو تو ہو، عقل مندی ہرگز نہیں۔ سارے دلائل ہمارے حق میں تھے، اس لیے اطمینان ہوا مگر ہمارے اطمینان نے ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک اور خیال چمکا اور چمک کر آنکھیں دکھانے لگا۔ وہ خیال یہ تھا کہ ہم نے دورانِ گفتگو مجلس میں اور تخلیے میں اساتذہ اور احباب کے سامنے بارہا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہم اردوئے معلیٰ کی ادبی نشستوں اور تمام ماحول سے بے حد متاثر اور اس کی افادیت کے دل و جان سے قائل ہیں۔ اب یہ عدم تاثراتی گفتگو ہمیں بے اعتبار کردے گی اور ہماری ساری بکریاں بھیڑیا کھا جائے گا، چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ مضمون ضرور لکھیں گے، خواہ ہمیں راتوں رات متاثر ہونا پڑے۔ فیصلہ کرتے ہی ہم مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ پھر ایک چادر سی ہمارے سامنے تن گئی اور یادوں کے مناظر حسین بگلوں کی طرح قطار اندر قطار ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے اور ہم انھیں قلم کی گرفت میں لینے کی کوشش میں منہمک ہوگئے۔

یہ سنیچر کی شام ہے۔ 'اردوئے معلیٰ' کی نشست کا آغاز ہونے والا ہے۔ اردوئے معلیٰ ایم۔اے کے طلبا کی انجمن ہے۔ اس کی ادبی نشستیں طالب علموں کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہ ایسی تربیتی کلاسیں ہیں جن میں طلبا اور طالبات اپنے اپنے مضامین اور تخلیقات سناتے ہیں اور ان پر تعمیری ادبی مباحث کے ذریعے تنقیدیں اور تبصرے ہوتے ہیں۔ ان نشستوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طلبا کے پڑھنے لکھنے کی تمام صلاحیتیں اساتذہ کی نگرانی میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پروان چڑھتی اور اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ کوئی بھی شخص ان نشستوں کی افادیت

اورنگ زیب فاسمی

www.urduchannel.in

سے انکار نہیں کرسکتا۔ اردوئے معلی کی ہر نشست ایک ایسی تربیتی کلاس ہے جس میں طلبا کو نہ صرف پڑھنے لکھنے کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ اس کے ذریعے ادبی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، میل مراسم پیدا کرنے، گفتگو کرنے، سوالات کرنے اور مہذب و شائستہ مذاق کرنے کی تربیت بھی ہوجاتی ہے۔

نشست کے خاتمہ پر اساتذۂ کرام طلبا کی تخلیقات اور تقریباً تمام حرکات و سکنات پر روشنی ڈالتے ہیں اور حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور مخلصانہ انداز میں ان کی اصلاح اور رہنمائی فرماتے ہیں۔ اس طور پر شعبہ اردو کے خوش نصیب طالب علم ان نشستوں سے علم و ادب اور عرفان حاصل کرتے ہیں۔

آج بھی میرے سامنے وہی نقشہ اور وہی منظر ہے۔ شعبۂ اردو کے کسی قدر طویل اور کشادہ کمرے میں میزوں کے اتحاد سے لمبی اور چوڑی کی گئی ٹیبل پر ایک خوش نما میز پوش بچھا ہوا ہے جس پر مساوی فاصلے سے تازہ پھولوں اور پتوں سے سجے سجائے تین خوبصورت گلدان رکھے ہیں۔ درمیان کا گلدان بڑا اور تانبے کا ہے۔ ہر شخص کی نگاہیں اس کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ لمبی میز کے دونوں جانب کرسیاں بچھی ہیں۔ کرسیوں کی پشت پر خوبصورت الماریاں سیکڑوں کتابوں کو سینے سے لگائے خاموش کھڑی ہیں۔ ان کے اوپر کتابوں کے خالق اپنی تخلیقات کے حفاظتی اور سلیقہ مندانہ اقدامات سے مطمئن اور ان کے استعمال سے شاداں اور فرحاں نظر آرہے ہیں۔ کمرے کے مغربی گوشے میں صوفہ سیٹ کے پاس والی دیوار پر قد آدم فریم میں غالب کا ایک نصف پورٹریٹ آویزاں ہے۔ پورٹریٹ کے بائیں جانب گوشہ بھوپال اور دائیں طرف گوشہ غالب و اقبال کی تختیاں اسٹیل کی الماریوں میں محفوظ کتابوں کی جانب توجہ دلا رہی ہیں۔ کمرے کی

جنوبی سمت کھڑکیاں ہیں جن میں سے دن کی روشنی مائل بہ پرواز ہے۔ چھت کے پنکھے پوری رفتار سے رقص کناں ہیں اور میز کے دونوں جانب ترتیب سے بچھی ہوئی کرسیوں پر اردو کے مہذب افراد تشریف فرما ہیں۔ مغرب کی سمت غالب کے پورٹریٹ کے بالکل سامنے لیکچر اسٹینڈ استادہ ہے۔ لیکچر اسٹینڈ کے دائیں سمت پہلی ہی کرسی پر شعبہ اردو کے صدر اور اس تربیت گاہ کے بانی پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب جلوہ افروز ہیں۔ کھلا ہوا رنگ، چمکتی ہوئی آنکھیں، قدرے گولائی لیے ہوئے بھرا بھرا سا چہرہ، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، دائیں ہاتھ پر نکلی ہوئی مانگ۔ بڑے پائنچے کے پاجامے کے ساتھ کالی پلین یا چوخانے کی شیروانی، کبھی شیروانی کے کپڑے والی اور کبھی بالوں والی ٹوپی، سیاہ رنگ کے سلیم شاہی جوتے کبھی پوری آستین اور کبھی آدھی آستینوں کا بشرٹ، فولڈ میری کا پتلون اور سردیوں کی ایوننگ اور نائٹ کلاسیز میں سیاہ چسٹر میں ملبوس، گٹھے ہوئے مضبوط سڈول صحت مند جسم اور درمیانے قد کے مالک، تیز مگر پُروقار چال چلتے ہوئے پُرکشش اور پُرجوش شخصیت کے مالک پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کو پہچان لینا مشکل نہیں ہے۔

آپ بات کیجیے، اگر آپ چھوٹے ہیں، طالب علم ہیں تو عزیزم کی پُرخلوص آواز سننے کے لیے تیار رہیں۔ خصوصاً اگر آپ نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے قوی صاحب متفق نہیں ہیں تو مسکرا کر عزیزم ضرور کہیں گے۔ اگر آپ کی بات پر صرف مسکرادیں اور عزیزم نہ کہیں تو انھیں اپنی بات سے متفق ہی سمجھیے۔ عزیزم کہہ دیں تو اب آپ ان سے متفق ہونے کا ذہن بنالیجیے کیونکہ ان کا استدلال آپ کو اتفاق رائے پر مجبور کردے گا۔ اگر آپ نے اب بھی قوی صاحب کو نہیں

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

پہچانا تو جایئے کسی ایسے صاحب کو تلاش کیجیے جو کالج میں، کالج سے باہر، گھر میں، گھر سے باہر، یہاں تک کہ بازار میں بھی کسی طالب علم خصوصاً اردو طالب علم کے حقوق پر تقریباً لڑنے جھگڑنے پر آمادہ نظر آتے ہوں، ہر مخالفت سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں، اپنے طلبا سے غیر معمولی محبت رکھنے کے باوجود اردو کے دیگر باصلاحیت طالب علموں کی تعریف وتوصیف اور حوصلہ افزائی میں بخل نہ کرتے ہوں اور اس معاملے میں کوئی تفریق وامتیاز روا نہ رکھتے ہوں۔ آپ بے جھجک انھیں قوی صاحب کہہ کر مخاطب کر سکتے ہیں۔ وہ ضرور قوی صاحب ہوں گے۔ اردو طلبا کے لیے ہمدردی اور خلوص وشفقت کا ایسا بے لوث جذبہ اگلے وقتوں کی چیز ہے نہ جانے قوی صاحب تک کیسے پہنچا؟ اردو زبان وادب سے قوی صاحب کا عشق دیوانگی کی حدوں میں داخل ہو چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اردو لکھنے والوں اور اردو پڑھنے والوں پر جان چھڑکتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے طالب علموں کو بھی شاید اسی لیے زیادہ عزیز رکھتے ہیں کہ یہ طالب علم دراصل اردو کے بھی طالب علم ہیں۔ اگر آپ شعبہ اردو میں قوی صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں تو آیئے۔ دیکھیے کرسیوں پر کپڑا پھیرتے، میزوں کو صاف کرتے، الماریوں میں کیلیں ٹھونکتے کتابوں کے چہرے سے گرد وغبار صاف کر کے انھیں بک شیلف میں دوبارہ سلیقے سے جماتے سجاتے، صاف شفاف لباس زیب تن کیے ہوئے جاذب نظر شخصیت کے مالک جو صاحب آپ کو شعبہ اردو میں ملیں گے، وہی اس شعبے کے صدر محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی ہوں گے۔

دیکھیے وہ دیکھیے، اردوئے معلی کی نشست کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک طالب علم اپنا مضمون سنا رہا ہے۔ اس کی دائیں طرف قوی صاحب بیٹھے ہیں۔ قوی

صاحب کس قدر انہماک سے طالب علم کا مضمون سننے کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات وسکنات، آواز وتلفظ اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ہر ادبی پروگرام میں ان کے استغراق کا یہی عالم رہتا ہے اور اسی استغراق وانہماک کی توقع وہ اپنے طالب علموں سے کرتے ہیں اور اس کے لیے تلقین کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ سب قوی صاحب بن جائیں گے تو پھر دوسری زبانوں کا کیا ہوگا؟ بے چاری دوسری زبانیں؟

لیجیے ہمارا انہماک ٹوٹنے لگا۔ انہماک کو جوڑیے اور وہ دیکھیے۔ قوی صاحب کے بالکل نزدیک دائیں جانب لکھنوی انداز کے ایک جیتے جاگتے مجسمے کی طرح ایک اور صاحب تشریف فرما ہیں۔ یہ شعبۂ اردو کے پروفیسر حیدر عباس رضوی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام کی طرح ایک کھلا ہوا قلم ہے۔ ان کے آگے ایک سادہ کاغذ ہے۔ رضوی صاحب اپنا مضمون یا اپنی تخلیق پڑھنے والے طالب علموں کے لیے کراما بھی ہیں اور کاتبین بھی۔ نشست کے اختتام پر یہ نامۂ خامہ، اعمال نامے کی طرح تقسیم ہونے کی بجائے برسر محفل سنایا جائے گا۔ یہاں غالب کی طرح اپنے آدمی نہ ہونے کی شکایت بھی ممکن نہیں کہ اپنے کئی آدمی ہیں مگر "دم تحریر" سے "دم تقریر" تک کوئی دم نہیں مار سکتا۔

رضوی صاحب سے ہر طالب علم جلد بے تکلف ہو جاتا ہے۔ ان میں استادانہ سنجیدگی سے زیادہ طالب علمانہ شوخی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اگر ایم اے کے طلبا سے مصروف گفتگو ہوں تو ایک نووارد کے لیے رتبے کی شناخت دشوار ہو جاتی ہے، مگر خود رضوی صاحب حفظ مراتب کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ اپنے اساتذہ کے احترام وعقیدت کے جذبہ کی عملی شکل آپ کو دیکھنی ہو تو رضوی صاحب

اورنگ زیب فاسمی

www.urduchannel.in

کو ان کے اساتذہ سے گفتگو کرتے ہوئے ضرور دیکھئے۔ رضوی صاحب اپنے استاد قوی صاحب کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اکثر فخریہ انداز میں کہتے ہیں میں نے آج تک اپنا کوئی مضمون استادِ محترم کے سامنے پیش کیے بغیر اشاعت کے لیے نہیں بھیجا۔ استاد کی ہر بات بے چوں و چرا قبول کرنے اور اس کی صحت پر کوئی نہ کوئی دلیل لانے کے سلسلہ میں رضوی صاحب کا جواب نہیں۔ ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ پچھلے دنوں سیفیہ کالج کے سالانہ مشاعرے کے موقع پر بیرونی شعراء کو مہمان خانے میں ٹھہرانے کے لیے قوی صاحب پلنگ بچھانے کی ہدایت فرمارہے تھے۔ راقم السطور اور ماجد حسین صدیقی محترم رضوی صاحب کے پاس کھڑے تھے۔ اس وقت ایک پلنگ پر نظر پڑی جس کا سرہانہ چپراسی کی غلطی سے مشرق کی سمت ہوگیا تھا۔ ہم نے رضوی صاحب کی توجہ مبذول کرائی۔ موصوف شاید اسی زاویے کو قوی صاحب کی ہدایت کے مطابق سمجھ رہے تھے۔ ہم سے بولے، جی ہاں ٹھیک ہے، اسے طرح ہونا چاہیے تاکہ سونے والا جب اٹھ کر بیٹھے تو اس کا منھ کعبہ شریف کی جانب ہو۔ ہم خاموش ہوگئے، اگرچہ اس تاویل سے تشفی نہ ہوسکی۔ اس وقت دیکھا کہ قوی صاحب مذکورہ پلنگ کا رُخ بدلوا رہے ہیں۔ جب رُخ تبدیل ہوگیا تو رضوی صاحب نے فرمایا، لیجئے اب ٹھیک ہے نا؟ اسی طرح زیادہ مناسب ہے۔ ہم سب اس فرماں برداری سے محظوظ بھی ہوئے اور متاثر بھی۔ قوی صاحب کی طرح رضوی صاحب بھی اپنے طلبا کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ تحریر و تقریر دونوں میں اپنے نپے تلے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جو الفاظ کی قدر و قیمت سے ان کی واقفیت کا ثبوت ہے۔

اساتذہ کے بعد اخلاق اثر صاحب کا خلوص اور محبت اور اردوئے معلی کے

نشستوں میں ان کی شرکت شعبۂ اردو کے طلبا کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ پرانے ساتھیوں میں اقبال مسعود صاحب کو دوست کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سینئرس میں سب سے زیادہ محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی تحریر میں بھی دل کشی کے سارے سامان موجود ہیں۔ اردو ادب کو ان سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں اور ایک اچھے دوست کی حیثیت سے وہ ہم سے وابستہ ہیں۔ محترم جمیل محوی صاحب کے تعلق سے شامِ جمیل کے موقع پر اپنے مفصل تاثرات کا اجمالی اظہار کر چکا ہوں۔ اب ان پر کچھ لکھنا، نہ لکھنے کے برابر ہے اس لیے کہ ابھی ہم ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں سے واقف ہوئے ہیں اور جن پہلوؤں سے واقف ہوئے ہیں، ان پر تمام احباب بھرپور روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب بھی اگر ان پر کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی تو ہماری ہوس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

اردوئے معلی کے قلم کاروں میں ماجد حسین صدیقی صاحب کی ذات و صفات نے بہت دنوں تک دھوکے میں ڈالے رکھا۔ دل یہ ماننے کو قطعی تیار نہ تھا کہ ماجد صاحب جتنے ہمارے سامنے ہیں اس سے زیادہ پوشیدہ ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ اپنا انشائیہ سنا رہے تھے، استادِ محترم نے ان کے چہرے کی فرشتگی کی جانب اشارہ کر ہی دیا۔ مضمون باغ و بہار تھا۔ پوری محفل زعفران زار ہو رہی تھی، مگر ماجد صاحب کے چہرے پر کیا مجال کہ مسکراہٹ بھی نظر آئی ہو۔ ایسی معصومیت کہ خدا کی پناہ! بس پھر کیا تھا یارانِ محفل تاڑ گئے اور ماجد صاحب کی شخصیت کے تمام پہلو یک لخت روشن ہوگئے۔ ہم سب جو یہ باتیں پہلے ہی جان چکے تھے کہ ماجد صاحب ایک مخلص اور ذہین ساتھی ہیں، اب یہ بھی سمجھ گئے کہ وہ

www.urduchannel.in

جب کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے چہرے پر شرارت بھری معصومیت اور دروغ مصلحت آمیز کے نقوش اس قدر واضح نہیں ہوتے کہ آپ کا دل ان کی کسی بات کو جھوٹ ماننے پر آمادہ ہو جائے۔ اکثر بھولے منھ سے نہایت خوبصورت کمنٹس کر ڈالتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کے جملوں میں ایہام تناسب اور حسن تعلیل دونوں صنعتیں شامل رہتی ہیں۔

رضیہ باجی کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا تعلق میرے وطن سرونج سے ہے اور سرونج کو جن لوگوں پر فخر کرنا چاہیے، میرے نزدیک ان میں رضیہ باجی بھی ہیں۔ اپنی کلاس کے ساتھیوں میں سب سے پہلے حسام الدین فاروقی، سکریٹری اردوئے معلی کی جانب نظر جاتی ہے۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھے ہیں اور ان سے گھنٹی بجانے کا اندیشہ بھی لاحق ہے۔ دراصل مختلف شخصیات کے بارے میں ہمارے تاثرات مختلف ہوتے ہیں، نہ شخصیات میں یکسانیت ہوتی ہے، نہ تاثرات میں۔ یہی وہ خاصیت ہے جس نے دنیائے آب وگل کو ''سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو'' کا مرکب بنایا ہے۔ یہی ہماری دنیا کا حسن ہے اور یہی اس کی گلدانیت۔ چنانچہ تاثرات میں یکسانیت نہ ہونے کے سبب سے کسی سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں کسی سے کم اور کسی سے بہت کم۔ لیکن عام حالات میں ہمارے برتاؤ سے اس کا اظہار و اندازہ نہیں ہوتا یا یوں کہیے کہ ہم کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ مثلاً میری کلاس کے تمام ساتھیوں سے میرا برتاؤ بظاہر یکساں ہو سکتا ہے مگر میرے جذبات و تاثرات مختلف ہوں گے۔ اس تمہید کی تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ حسام بھائی نے مجھے اپنے بے پایاں خلوص اور خصوصاً قوت برداشت کی راہ سے سب سے زیادہ

متاثر کیا ہے، مگر آج سے پہلے میں نے اس بات کا اتنا واضح اعتراف نہیں کیا تھا ممکن ہے مجھے اس کا احساس بعد میں ہوا ہو۔ سب اس کی تائید کریں گے کہ اردوئے معلی کی نشستوں کو انھوں نے جس طرح بحال رکھا ہے وہ ان کی محنت اور شفقت پر دال ہے۔ ان کی بھینی بھینی دلوں کو زیر و زبر کرنے والی مسکراہٹ، یوں تو سبھی کو پسند ہے لیکن میں نے اسے ''مونا لیزا'' کی مسکراہٹ کا نام دیا ہے، حالانکہ ماجد حسین صدیقی صاحب نے شام جمیل میں شرارتاً اس تشبیہ کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے، لیکن میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ حسام بھائی کی مسکراہٹ کے تعلق سے یہ مثال سب سے پہلے میری زبان پر آئی تھی۔ حسام بھائی ہماری محفلوں کی رونق ہیں اور میں خوش ہوں کہ ان کی صورت میں مجھے ایک ایسا ساتھی حاصل ہے جو دل کا صاف اور لباس و بدن کا شفاف ہے۔

محمد نعمان خاں کی بھولی بھالی شکل ایک ایسا آبی نقاب ہے جس کے نیچے بہت ساری شرارتیں موجود ہیں۔ نہایت حساس، محنتی، ذمہ داری کا احساس رکھنے والے خوش مذاق و خوش مزاج ساتھی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی غیر موجودگی میں ان کی غیر موجودگی کا احساس ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقیناً کچھ ایسی خصوصیات کے حامل ہیں جو احباب کی ہر محفل میں ان کی موجودگی کو لازمی بناتی ہیں۔ شام جمیل میں ان کے نہایت فصیح و بلیغ خطبہ صدارت نے یہ ثابت کر دیا کہ اس موقع پر اس کرسی کے صحیح حقدار محمد نعمان اور صرف محمد نعمان ہیں۔ سنجیدگی، بردباری، شرارت، ذمہ داری اور شوخی و لطافت کی ملی جلی کیفیت محمد نعمان کی فطرت کا عطر اور چہرے کا غازہ ہے۔

ڈاکٹر قمر علی شاہ نہایت مجلب پسند، بلکہ مجلت گزیدہ مگر زندہ دل، اور خوش

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

لباس ساتھی ہیں۔ مجلس اردو کے صدر ہونے کے باوصف انھوں نے کیا صدارت اور کیا مجلس اردو، کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ''مجلس اردو کے صدر ہیں۔'' مجھے ان کی وقت کی پابندی والی ادا بہت پسند ہے۔ صحیح وقت پر کالج آتے ہیں اور صحیح وقت پر چلے جاتے ہیں۔ خلیق، وسیع القلب اور باصلاحیت ساتھی ہیں۔ کچھ پڑھتے اور بولتے وقت لہجے میں اعتماد جیسی کوئی شئے پیدا ہو جاتی ہے، جسے احباب چیخ و پکار سمجھ بیٹھتے ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز قدرے تحکمانہ ہے جو کبھی کبھی دوستانہ گفتگو میں بھی چمک مارتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر قمر علی شاہ، جنھیں احباب پیار سے ڈاکٹر مصروف بھی کہتے ہیں ایک اچھے دوست ہیں۔

اب رہے بی اے کے وہ طلبا جو ادبی ذوق کے وسیلے سے ایک دوسرے سے قریب ہیں اور ''مجلس اردو'' سے لے کر ''اردوئے معلیٰ'' کی ادبی نشستوں میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ ان میں محمد نسیم، سکندر غالب اور خالد کمال کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ تینوں ایسے باکمال جونیئر ساتھی ہیں کہ اگر لکھتے پڑھتے رہے تو سیفیہ کالج، بھوپال اور اردو، تینوں کا نام روشن کریں گے۔ بحیثیت مجموعی سیفیہ کالج کا شعبہ اردو اور اس سے متعلق تمام صورتیں اتنی دلآویز ہیں کہ فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اس باغ کا ہر پھول خوش رنگ و خوش ادا ہے اور اپنی بھینی بھینی خوشبو سے اس کی رومان پرور فضا کو معطر کیے ہے، اس کا ہر نقش اتنا حسین اور جاذب نظر ہے کہ جو دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

○○

''..... خالد محمود بہ یک وقت ایک ممتاز نثر نگار بھی ہیں اور خوش بیان شاعر بھی، ایک معتبر محقق بھی ہیں اور مقبول معلم بھی۔ بزم آرائیوں کا محور بھی ہیں اور لطائف و ظرافت کا مرکز بھی۔ جب احباب کی صحبتوں اور ادبی محفلوں میں لب کشا ہوتے ہیں تو پوری محفل قہقہہ زار بن جاتی ہے اور خالد محمود بزم آراء کا محور قرار پاتے ہیں، مگر جب وہ سیمنار میں کسی سنجیدہ موضوع پر اپنا کوئی تنقیدی یا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہیں تو موضوع پر ان کی گرفت اور ان کی عمیق نگاہی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ اپنے مقالے میں متوازن اور معقول نتائج اخذ کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کے نئے گوشوں اور نئے امکانات کی طرف نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔''

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

"..... خالد محمود بہ یک وقت ایک ممتاز نثر نگار بھی ہیں اور خوش بیان شاعر بھی، ایک معتبر محقق بھی ہیں اور مقبول معلم بھی۔ بزم آرائیوں کا محور بھی ہیں اور لطائف وظرافت کا مرکز بھی۔ جب احباب کی صحبتوں اور ادبی محفلوں میں لب کشا ہوتے ہیں تو پوری محفل قہقہہ زار بن جاتی ہے اور خالد محمود بزم آراء کا محور قرار پاتے ہیں، مگر جب وہ سیمنار میں کسی سنجیدہ موضوع پر اپنا کوئی تنقیدی یا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہیں تو موضوع پر ان کی گرفت اور ان کی عمیق نگاہی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ اپنے مقالے میں متوازن اور معقول نتائج اخذ کرتے ہوئے تحقیق وتنقید کے نئے گوشوں اور نئے امکانات کی طرف نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔"

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام

انوار قرآن

مرتبہ : نثار احمد فاروقی

صفحات: 88

قیمت : -/49 روپے

پروفیسر آل احمد سرور

مرتبہ : خلیق انجم

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

انارکلی

مصنف : امتیاز علی تاج

صفحات : 184

قیمت : -/60 روپے

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

مصنف : مالک رام

صفحات: 224

قیمت : -/81 روپے

خواجہ حسن نظامی

مرتبہ : نثار احمد فاروقی

صفحات: 160

قیمت : -/66 روپے

خسرونامہ

مصنف : مجیب رضوی

صفحات: 124

قیمت : -/56 روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ترجمہ : ندیر الدین مینائی

صفحات : 84

قیمت : -/48 روپے

ایک چادر میلی سی

مصنف : راجندر سنگھ بیدی

صفحات : 116

قیمت : -/48 روپے

اورنگ زیب قاسمی

ISBN : 978-81-7587-809-9

9 788175 878099

₹ 68/-